مقالاتِ اختر

قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی

مقالات اختر

مع مقدمہ

از ڈاکٹر ممتاز حسن

ترقی اردو بورڈ، ۱۴ ڈی بلاک بی تیموریہ، کراچی

مئی ۱۹۷۲ء

مطبع فیروز سنز لمیٹڈ کراچی

فہرست مضامین

	صفحہ
فردوسی کا بزمیہ کلام	۱
ابوالعلا معری اور عمر خیام	۱۰
سندھ کا فارسی ادب	۳۸
امیر خسرو اور تصوف	۴۸
شبلی کی فارسی شاعری	۵۴
حیات نظامی گنجوی	۹۱
تاریخ وفات نظامی گنجوی	۱۳۶
نظامی گنجوی کی قبر	۱۴۹
دیوان نظامی کے قلمی نسخے	۱۵۲
سحابی نجفی	۱۶۷
دیوان میر رضی	۱۷۴
نامۂ نامی	۱۷۸
مرأة الخیال	۱۸۶
مثنوی آشوب ہندوستان	۲۰۶
فتوح السلاطین از عصامی	۲۲۱
تاریخ ابن خلکان کے فارسی ترجمے	۲۳۰

مقدمہ
از
ممتاز حسن

قاضی احمد میاں اختر مرحوم و مغفور کے مضامین کا یہ مجموعہ ان کے انتقال کے ۱۶ برس بعد شائع ہو رہا ہے ۔ اس مجموعے میں وہی مقالے شامل کیے گئے ہیں جن کا تعلق فارسی زبان و ادب اور بر صغیر میں اس کے علمی اور ثقافتی اثرات سے ہے ۔

ترقیٔ اردو بورڈ یہ کتاب ایرانی شنہشاہیت کے دو ہزار پانچسو سالہ جشن کے موقع پر شایع کر رہا ہے ۔ ایران، پاکستان کا دوست اور ہمسایہ ہے ۔ فارسی زبان برصغیر میں مسلمانوں کے دور حکومت کے تقریباً ایک ہزار سال تک سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے، اس دور کی تہذیب و ثقافت بیشتر اسی بنیاد پر قائم ہوئی ؛ اور برصغیر کے بڑے بڑے مورخ، شاعر اور مصنف اپنے جذبات اور خیالات و واقعات کو اس زبان کے ذریعے بیرونی دنیا تک پہنچاتے رہے ۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی میں غالب نے اور بیسویں صدی میں اقبال نے فارسی کو اردو پر ترجیح دی، ایران کے مشاہیر جن میں ادبا، فضلا اور شعرا شامل تھے اکثر اس بر صغیر میں مہمان کی حیثیت سے وارد ہوے، اور ان میں سے بعض نے اپنی عمر کے کئی سال یہاں گزارے ۔ پاکستان کی دونوں قومی زبانیں اردو اور بنگالی فارسی سے گہرے طور سے متاثر ہیں اور یہی حال دوسری مقامی زبانوں کا بھی ہے ۔ آج اگرچہ افسوس ہے کہ فارسی زبان و ادب کا ہمارے ہاں وہ مقام نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا مگر اس گئے گزرے زمانے میں بھی پاکستان میں فارسی میں نظم و نثر کے لکھنے والے موجود ہیں ۔ اقبال کے انتقال کو ۳۴ برس نہیں ہوئے ۔

لاهور، کراچی ، ملتان، حیدر آباد، ڈھاکہ، سلہٹ اور دوسرے مقامات پر اب تک فارسی گو شعرا موجود ہیں اور فارسی آتی ہو یا نہ آتی ہو اکثر لوگوں کے دل میں اس زبان سے اور ایران سے ایک تعلق خاطر ضرور قائم ہے۔ اسی وجہ سے ترقیٔ اردو بورڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس اہم موقع پر جب کہ ہمارے ایرانی بھائی جشن منا رہے ہیں، ہمارے لیے ان کی خوشی میں شریک ہونے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ ہم فارسی زبان کی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کریں۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم و مغفور جوناگڑھ کے ایک معزز اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے اجداد سندھ سے جوناگڑھ گئے تھے۔ اس خاندان کے پاس دولت، جاگیریں اور دنیوی عزت بمقدار وافر موجود تھی۔ قاضی صاحب کی خاندانی وجاہت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب تقسیم سے قبل جوناگڑھ میں پبلک کے نمایندوں پر مشتمل ایک وزارت بنانے کا سوال پیدا ہوا تو اس میں سب سے پہلا نام احمد میاں کا تھا۔ یہ بات مجھ سے عبدالقادر محمد حسین مرحوم نے کہی جو ایک زمانے میں جوناگڑھ کے دیوان تھے۔

قاضی صاحب معلوم ہے کرنا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قاضی عبداللہ اور دادا کا قاضی سلیمان تھا۔ یہ ایک عجیب توارد ہے کہ ابوالعلاؐ المعری کاشجرہ بھی تین پشت تک انہی ناموں پر مشتمل ہے۔ قاضی صاحب کہا کرتے تھے، مجھے ابوالعلاؐ سے اتنی دلچسپی کی خاص وجہ یہی توارد ہے، مگر اس قول کو محض ان کی خوش طبعی سمجھنا چاہیے، ورنہ دنیا کا کوئی موضوع، علمی تحقیق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو قاضی صاحب کی نگاہ سے اوجھل رہا ہو۔ مجھے آج تک تحقیق اور جستجو کا کوئی مسئلہ ایسا یاد نہیں ہے جس میں انہیں دلچسپی نہ ہو، اور یہ تحقیقی مسئلے محض خشک موضوعات سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو قاضی صاحب اپنی سنجیدہ اور متوازن طبیعت کے باوجود گفتگو کو رنگینی کی حد تک پہنچا دیتے تھے۔ البتہ جو بات کہی جاتی تھی وہ معمولی ہو یا غیر معمولی، متین اور پروقار ہو یا ہلکی پھلکی، ہمیشہ ایک علمی پہلو لیے ہوتی تھی اور متانت اور شگفتگیٔ طبع ان میں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ اور جب انسان ان کے پاس سے اٹھ

کر آتاتھاتو ان کی چند مسکراہٹوں اور قہقہوں کی یاد کے علاوہ اپنے ذہن میں کچھ علمی اضافوں کا سرمایہ بھی لے کر آتا تھا۔ ہر بار ایک نیا سرمایہ۔ میں نے جن علما کو قریب سے دیکھا ہے ان میں دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کا ہمپایہ مجھے نہیں ملا۔ ایک مولانا عبدالعزیز میمن دوسرے قاضی احمد میاں اختر۔ مگر ان دونوں بزرگوں میں بڑا فرق تھا۔ مولانا عربی‌ادب، لغت، انساب، اسماء الرجال اور ہر اس چیز کے جس کا تعلق عربی ادب سے ہے، متخصص ہیں۔ خدا انہیں زندہ اور خیریت سے رکھے۔ آج بھی ایک لاکھ سے کم عربی اشعار کیا یاد ہوں گے قاضی صاحب اس کے برعکس عربی، فارسی، گجراتی، انگریزی اور سنسکرت سب کے ادب سے واقف تھے، اور محض ادب ہی ان کا موضوع نہیں تھا، زندگی کا کوئی شعبہ، انسانی طبیعت کا کوئی مظاہرہ ایسا نہیں تھا جس سے وہ محظوظ نہ ہوتے ہوں۔ یوں سمجھیے کہ وہ ایک بہتے دریا تھے جس کا تماشا آپ ساحل پر بیٹھ کر بھی کر سکتے ہیں اور اس کے اندر پیراکی کو بھی آزما کر لطف اٹھا سکتے ہیں۔ میں نے مولانا میمن کو یہ کہتے سنا ہے کہ جو میری کمزوریاں ہیں وہ قاضی صاحب کے کمالات ہیں۔

ایک بات جو مولانا میمن اور قاضی صاحب میں مشترک دیکھی وہ یہ تھی کہ دونوں میں سے کسی کے ہاں سرسری اور سطحی کام کی گنجائش نہیں تھی۔ مولانا میمن بات کرتے ہیں تو ایسامعلوم ہوتا ہے کہ سننے والے تحقیق کے موتی رول رہے ہیں۔ یہی حال قاضی صاحب کا تھا۔ میں کہیں بیان کر آیا ہوں کہ کس طرح میں نے ان سے اقبال کے متعلق ایک مقالہ لکھنے کی درخواست کی اور انہوں نے 'اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھ ڈالی۔ کیونکہ اس سے کم میں ان کی علمی جستجو کی تسکین ممکن نہیں تھی۔

قاضی صاحب نہ صرف صوم و صلواۃ کے پابند تھے بلکہ اسلام کی روح سے ہم آہنگ تھے۔ عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوز دروں دونوں خدا نے انہیں عطا کیے تھے۔ ان کی طبیعت میں دوستی کا ملکہ تھا۔ ان کا دشمن نہ کوئی دیکھا نہ سنا۔ ممکن ہے کوئی ہو گذرا ہو۔ البتہ وہ ہر ناپسندیدہ چیز کو اس آسانی سے نظر انداز کر دیتے

تھے کہ دیکھنے والے کو قرآن کے الفاظ 'و اذا مروا باللغو مروا کراما' یاد آ جاتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصے کی حالت میں نہیں دیکھا، نہ کبھی اونچی آواز میں کسی پر رعب گانٹھتے سنا۔ ان کی آواز بھی خود انہی کی طرح معتدل اور متوازن ہی دیکھی۔ جسم کسرتی تھا، مگر مصائب نے عارضۂ قلب میں مبتلا کر دیا تھا اور وہی جان لیوا ثابت ہوا۔

رہیں ذاتی یادیں، تو آدمی کیا کہے کیا نہ کہے۔ اب وہ مجالس یاد آتی ہیں تو ان کی یاد ایک اذیت سی بن جاتی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتی ہے کہ سید حسام الدین راشدی، جناب حفیظ ہوشیارپوری اور یہ خاکسار ہفتے میں کم سے کم دو تین مرتبہ ٹھٹائی کمپاؤنڈ کی چوتھی منزل پر پہنچ کر شام کے وقت قاضی صاحب سے ملاقات کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس مجلس کو خود مرحوم نے اخوان الصفا کا نام دے رکھا تھا۔ ان دنوں قاضی صاحب انجمن ترقیٔ اردو میں ملازم تھے، ایک چھوڑ کئی کئی رسالوں کی ادارت اور نگرانی فرماتے تھے۔ اور تنخواہ جو ملتی تھی اس کا ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہو۔ انہوں نے نہ زیادہ مانگی نہ انجمن نے دی۔ صبح سے شام تک مصروف رہتے تھے، البتہ صبح خود سبزی خریدتے اور رات کو اخوان الصفا کی محفل جماتے۔ ان دونوں وظیفوں میں ناغہ نہ ہوتا تھا۔

کبھی کبھی ان کی متانت طبع سے دوستوں کو خواہ مخواہ کا فائدہ پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن اپنی کتابوں کا ایک صندوق دیکھ رہے تھے، میں پاس بیٹھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے عمر خیام کا ایک مصور نسخہ نکلا۔ جس میں حسب معمول کچھ آزاد قسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، میں نے عمداً اور شرارتاً بڑ، تعریف کی۔ کہنے لگے۔ لا حول و لا قوۃ، یہ واہیات چیز کہاں سے نکل آئی۔ یہ تو آپ کی توجہ کے لائق ہے اور وہ نسخہ اٹھا کر مجھے دے دیا۔ اب بھی میرے عمر خیام کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔

ان کے کمرے میں ان کے ارد گرد ان کی بیش قیمت لائبریری جس میں مختلف قسم کے نوادر موجود تھے کہیں الماریوں میں چنی ہوئی کہیں انباروں کی شکل میں میزوں، کرسیوں پر دھری نظر آتی تھی۔

جب تقسیم کے بعد قاضی صاحب نے جونا گڑھ چھوڑا ہے تو سردار ولبھ بھائی پٹیل کی طرف سے انہیں متعدد پیغامات پہنچے کہ آپ جونا گڑھ میں رہیے ہم آپ سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ آپ مسلم لیگ کے لیڈر تھے، لیکن اب آپ بھی بھول جائیے، ہم بھی بھول جائیں گے۔ مگر قاضی صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے اہل و عیال اور اپنی لائبریری کے ایک تہائی حصے کو لے کر اپنے آبائی وطن سے نکلے۔ اس پر آشوب زمانے میں کسی صورت سے پرتگیزی جزیرہ دیو تک پہنچے، اور وہاں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ اس بلند پایہ عالم اور عالی مرتبت امیر الاسراء نے بے سرو سامانی میں گذارا۔ آخر کسی طرح دیو سے بھاگ کر پاکستان پہنچے۔ مجھ سے پہلی مرتبہ ان کی لائبریری کی کتابوں کے سلسلے میں ملاقات ہوئی۔ میں محکمہٴ مالیات کا سکرٹری تھا اور قاضی صاحب کی کتابوں کی بات تو فوراً طے ہوگئی۔ مگر اس لمحے جس دوستی کی بنیاد پڑی وہ آج بھی میرے لیے سرمایہٴ حیات ہے۔

قاضی صاحب کے لیے موت کوئی خوفناک چیز نہیں تھی۔ میں جب انگل روڈ (موجودہ سرور شہید روڈ) پر مقیم تھا۔ تو ایک شام میں نے ان کے پاس خاطر سے ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ صدر مشاعرہ بھی وہی تھے۔ مشاعرے کے دوران انہیں پیٹ اور دل کے درمیان درد اٹھا۔ ایک دو ڈاکٹر موجود تھے۔ انہوں نے دیکھ کر کہا کہ دل کا دورہ تو نہیں ہے مگر انہیں فوراً گھر جانا چاہیے، اور آرام کرنا چاہیے۔ ایک آدھ دوا بھی بتائی۔ میں انہیں موٹر میں بٹھا کر ٹھٹائی کمپاؤنڈ لے گیا۔ وہاں چار منزلیں اوپر جانا تھا۔ میں نے چاہا کہ قاضی صاحب کو ایک کرسی پر بٹھا کر ان کے فلیٹ تک لے جاؤں۔ مگر انہوں نے سختی سے منع کیا اور خود ہی سیڑھیاں چڑھنی شروع کر دیں۔ ناچار میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ میرا سہارا انہوں نے قبول کیا۔ حتیٰ کہ ہم ان کے فلیٹ کے دروازے تک پہنچ گئے۔ وہاں قاضی صاحب نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اپنی ساری کرب و اذیت بھول گئے اور مسکرا کر غالب کا شعر پڑھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ نا گہانی اور ہے

دوسرا مصرعہ دہرایا اور اندر داخل ہو گئے۔

ان کے تحمل کا ایک واقعہ سنیے - ایک روز میں اپنے بیوی بچوں اور قاضی صاحب کے ہمراہ سیر و تفریح کے لیے ٹھٹے گیا - ہم لوگوں کی ان سے اکثر درخواست ہوتی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ چلیں - یہ درخواست وہ ہمیشہ قبول فرماتے تھے - کبھی کبھار ان کی بچیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں - ورنہ وہ اکیلے ہی تشریف لے آتے تھے - جب ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھا چکے تو حسب معمول واپسی کی فکر ہوئی - بیوی نے کھانے پینے کے برتن سب باندھ بندھا کے موٹر میں رکھوا دیے - مگر اس مرحلے پر موٹر بگڑ گئی - اور اسے ٹھیک کرنے میں آدھ گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ لگ گیا - ہمیں دیر ہو رہی تھی مگر بالآخر جو خرابی تھی وہ دور ہو گئی- اور ہم واپس ہوئے - راستے میں میں نے غالباً تیزرفتاری کا مظاہرہ کیا تو قاضی صاحب نے فرمایا آپ جلدی نہ کیجیے - میں وقت پر پہنچ جاؤں گا - میں نے تعجب سے پوچھا -قاضی صاحب آپ کو کہیں جانا تھا- فرمایا کچھ نہیں آج ایک براڈکاسٹ ہے - مین حیران رہ گیا- کیونکہ اس سے پہلے صبح سے لے کر اب تک انھوں نے اس اہم پروگرام کے متعلق مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا - اگر موٹر قاضی صاحب کی ہوتی اور براڈ کاسٹ میرا ، تو کیا اودھم مچتا - میں اس کا فیصلہ محض آپ کے تخیل پر چھوڑتا ہوں - یا قاضی صاحب کی جگہ آپ ہوتے تو ؟

قاضی صاحب کو موٹروں کے انجن اور کل پرزوں سے خوب واقفیت تھی - ایک دفعہ انگل روڈ پر میرے ہاں تشریف لائے - تو میرا لڑکا جو اب ماشاء اللہ آٹو موبیل انجینیر ہے - اپنی موٹر پر کچھ کام کر رہا تھا - قاضی صاحب بھی ادھر تشریف لے گئے - انجن کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر جو انھوں نے باتوں ہی باتوں میں امتیاز صاحب کو ہدایات دی ہیں تو وہ حیرت زدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ قبلہ آپ کو تو موٹروں کے متعلق اتنی معلومات ہیں کہ انجینیروں تک کو نہیں ہوتے - آہستہ سے فرمایا - ہاں میرے پاس ڈاج گاڑی تھی - اس سے پہلے اور گاڑیاں بھی تھیں - یہ صرف ایک ہی موقعہ تھا - جب انھوں نے جوناگڑھ کے امیرانہ ٹھاٹھ کی طرف کوئی اشارہ کیا ہو، ورنہ وہ گفتگو کا رخ کبھی ادھر نہیں ہونے دیتے تھے - ہمارے ملک میں ایسے اصحاب موجود ہیں جنھوں نے آزادی اور تقسیم میں کچھ بھی نہیں کھویا - مگر پاکستان سے معاوضے کے طالب ہوئے اور جو چاہا لے لیا - قاضی صاحب ان نادر الوجود ہستیوں میں سے تھے جنھوں نے پاکستان کی خاطر

سب کچھ کھودیا ۔ مگر یہاں آ کر نہ اپنی قسمت کا رونا رویا نہ کسی سے کچھ مانگا ۔

قاضی صاحب نمائش سے کوسوں دور بھاگتے تھے ۔ ایک دفعہ انھیں لاہور جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہاں کسی صاحب سے ملنے گئے ۔ انھوں نے پوچھا ۔ قاضی صاحب آپ کہاں ٹھیرے ہیں ۔ فرمایا یہیں ایک دوست کے ہاں ۔ اتنے میں گورنمنٹ ہاؤس کی ایک شاندار کار دروازے پر آ کھڑی ہوئی ۔ ڈرائیور نے قاضی صاحب کے سامنے اٹن شن ہو کر سلیوٹ کیا اور کہا حضور کار حاضر ہے ۔ جب بھی ضرورت ہو میں یہیں موجود ہوں ۔ جن صاحب کے پاس قاضی صاحب بیٹھے تھے وہ کہنے لگے ۔ قاضی صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو گورنر صاحب نے بلوایا ہے ۔ کہیں دیر تو نہیں ہو رہی ۔ مسکرا کے فرمایا ۔ نہیں کوئی جلدی نہیں ہے ۔ وہی تو وہ دوست ہیں جن کے ہاں ٹھیرا ہوا ہوں ۔ اس زمانے میں چندریگر صاحب پنجاب کے گورنر تھے اور وہ قاضی صاحب کے پرانے دوستوں میں سے تھے ۔

زندگی کے آخری دو تین سال قاضی صاحب نے سندھ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے گذارے ۔ وہیں ۶ ۔ اگست ۱۹۵۵ء کو انتقال ہوا ۔ ایک تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ دن میری سالگرہ کا دن تھا ۔ نعش حیدر آباد سے اسی شام کو کراچی لائی گئی ۔ میوہ شاہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی ۔ خدا جانے قاضی صاحب کے اس روز رخصت ہونے میں کیا مصلحت تھی ، لیکن اس عجیب اتفاق کے بعد میری ہر سالگرہ پر ان کی یاد ناگزیر ہو گئی ہے ۔ اور یہ رشتۂ مودت جسے وہ اس قدر مستحکم کر گئے ہیں حین حیات تک تو ٹوٹ نہیں سکتا، ممکن ہے کہ آگے چل کر بھی نہ ٹوٹے ۔

ممتاز حسن

کراچی
۳ ۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء ۔

فردوسی کا بزمیہ کلام

عجم کا نامور شاعر فردوسی اپنی غیر فانی رزمیہ نظم شاہنامہ کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کر چکا ہے ۔ اس لیے اس شاہکار کے بعد کسی دوسرے کلام کو اس سے منسوب کرنے کی حاجت باقی نہیں رہتی، لیکن مورخین اور تذکرہ نویسوں نے شاہنامہ اور مثنوی یوسف و زلیخا کے علاوہ بھی فردوسی کے بزمیہ کلام از قسم قصائد و غزلیات، قطعات، رباعیات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور بعض نے متفرق اشعار بھی نقل کیے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایران کا یہ مایۂ ناز رزمیہ نویس بزمیہ شاعری پر بھی قدرت رکھتا تھا، اگرچہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فردوسی نے کوئی دیوان مرتب کیا ہو، دولت شاہ کے اس بیان سے کہ:

شاعری پیشہ ساختہ، قطعہ و قصائد می گفت، از خاص و عام وجہ معاش بدومی رسید (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ لکھنے سے پیشتر فردوسی بھی اور پیشہ ور شاعروں کی طرح قصائد و غزلیات لکھ کر معاش حاصل کرتا ہو گا۔ لیکن نظامی عروضی کا بیان ہے کہ فردوسی کا پیشہ زمینداری تھا جس کی آمدنی سے وہ کسب معاش کرتا تھا، ۲ اس لیے ظاہر ہے کہ معیشت کے لیے وہ کسی کا محتاج نہ تھا، اسی طرح جو اشعار قصائد وغیرہ کے ملتے ہیں ان سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہو۔ بہر حال اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے قصائد و غزلیات وغیرہ لکھے تھے جن کا بہت سا حصہ برباد ہو گیا اور بالفعل نایاب ہے۔

---

(۱) تذکرۂ دولت شاہ ص ۱۱ طبع بمبئی (۲) چہار مقالہ ص ۴۹ طبع ایران شہر برلن

خود فردوسی اپنی مثنوی یوسف و زلیخا میں (۱) جو اس کی آخر عمر کی تصنیف ہے ، اپنے عاشقانہ اشعار و غزلیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

بسے نامۂ دوستان گفته ام، الخ
همیدون بسی رانده ام گفتگوی زخو باز شکر لب ما هروی

لیکن صاحب مرأة الخیال کے نزدیک شاہنامہ کے سوا فردوسی کا اور کلام نہیں ہے (۲) اس پر تنقید کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں :

تذکرۂ مرأة الخیال میں جو لکھا ہے کہ سوائے شاہنامہ کے کوئی اور نظم اس کی نہیں یہ غلط ہے کیونکہ قصۂ حضرت یوسف راقم نے بچشم خود دیکھا ہے . . . دو قطعے جو تاریخ ہفت اقلیم میں دیکھے گئے اہل اخلاق کے لیے تحفۂ دلکش ہیں''(۳) - اس کے بعد آزاد نے ہفت اقلیم کے حوالے سے تین قطعے اور ایک رباعی نقل کی ہے -

حمد اللہ مستوفی نے لکھا ہے کہ شاہنامہ کے علاوہ فردوسی کے عمدہ اشعار ہیں اور ایک غزل کے چار شعر نقل کیے ہیں- (۴)

لطف علی آذر نے بھی فردوسی کے اشعار نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ''چند بیتے از قصائد و قطعات و رباعیات کہ در بعضے کتب متفرقه بنظر رسیده منتخب و نوشته شد'' (۵).

رضا قلی هدایت نے بھی لکھا ہے کہ مثنویات کے علاوہ فردوسی کے قصائد اور غزلیات بھی تھیں جو باقی نہیں رہیں اور متفرق اشعار نقل کیے ہیں-

فردوسی کے بزمیہ کلام (قصائد و غزلیات وغیرہ) پر یوروپین مستشرقین

---

(۱) چند سال ہوئے پروفیسر شیرانی نے رسالہ اردو میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں مثنوی یوسف و زلیخا کو فردوسی سے نہ منسوب کرنے کی وجوہ پر مفصل بحث کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ مثنوی فردوسی کی تصنیف سے نہیں ہے -

(۲) مرأة الخیال ص۲۷ بمبئی-

(۳) نگارستان فارس ص ۱۶ - ۱۷ (۴) تاریخ گزیده ص ۸۲۴، طبع عکسی لندن، (۵) آتش کده (۶) مجمع الفصحا، جلد اول ۳۸۳ - ۳۸۴-

ڈاکٹرایتھے (ETHE) نے ایک مضمون بعنوان (FIRDUSIALSYRIKER) لکھا تھا جو میونچ (جرمنی) کے رسالہ(UNGSBERICHTE)جلد ۲، ۱۸۷۰ء ص ۲۷۵ - ص ۳۰۴، اور جلد ۳-۱۸۷۳ء ص ۶۳۳ - ۶۵۳)میں شائع ہوا تھا۔ پروفیسر براؤن نے اس مضمون کا حوالہ اپنی کتاب میں دیا ہے(۱)۔اصل مضمون جرمن زبان میں اور بالفعل نایاب ہے، صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ ایتھے نے اپنے مضمون میں جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے وہ حسب ذیل ھیں:

۱ - مجموعۂ اشعار شعرائے متقدمین یعنی ایک سو ستر شعرا کے اشعار جو زیادہ تر فردوسی کے پیش رو اور اس کے معاصر شعرا کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہے۔
۲ - مخزن الغرائب، تذکرۂ شعرائے فارسی، قلمی۔
۳ - مخزن الغرائب۔اسی نام کا ایک اور رسالہ۔
۴ - لباب الالباب عوفی۔
۵ - آتشکدۂ آذر۔
۶ - ہفت اقلیم امین رازی۔
۷ - ریاض الشعراء والہ داغستانی۔
۸ - لب لباب۔
۹ - خلاصۃ الافکار۔
۱۰ - بتخانہ۔
۱۱ - منتخب التواریخ بدایونی۔

مندرجۂ بالا کتابوں میں فردوسی کے جو اشعار منقول ھیں ، ان کو ایتھے نے یکجا کر دیا ہے جن میں ایک قصیدہ، ۴۵ شعر کا، تین غزلیں، چھ رباعیاں، تین قطعے اور دو قصیدے اور ھیں۔ لیکن ایتھے کے منقولہ بعض قطعے اصلی نہیں ھیں جیسا کہ ان کی سست بندش اور بے ربطی سے پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ایک ایرانی محقق نے یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مدح میں جو اشعار ھیں وہ تمام تر متوسطین اور متاخرین کی تصنیف سے ھیں (۲)

ایتھے کی کتب مرجوعہ میں اکثر قلمی کتابیں ھیں۔ جو عسیرالحصول

---

(۱) لٹریری ہسٹری آف پرشیا، جلد ۲ ص ۱۴۲ کا نوٹ نمبر ۱۔
(۲) مجلہ کاوہ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ ص ۳۰، طبع برلین۔

ھیں۔ اس لیے اس کی بیان کردہ تین مطبوعہ کتابوں لباب الالباب، آتشکدہ اور منتخب التواریخ کے علاوہ بعض دیگر کتب تذکرہ کی مدد سے ہم ذیل میں فردوسی کے اشعار نقل کرتے ھیں:

۱ - لباب الالباب عوفی (جلد دوم صفحہ ۳۳ طبع لندن)

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم	زگفتار تازی واز پهلوانی
بچندین هنر شصت و دو سال بودم	که گوشه برم ز آشکارونهانی
بجز حسرت و جز و بال گناهان	ندارم کنون از جوانی نشانی
بیاد جوانی کنون سویه آرم	بدین بیت بو طاهر خسروانی
جوانی من از کودکے یاد دارم	دریغ از جوانی دریغ از جوانی

۲ - تاریخ گزیدہ (صفحہ ۸۲۴ طبع عکسی، لندن)

شبے ور برت گر بر آسود می	سر فخر بر آسمان سود می
قلم در کف تیر بشکستمی	کلاه از سرمہر بر بود می
بقدر از منم چرخ بگذشتمی	به پی فرق کیوان بفر سود می
به بیچارگان رحمت آوردمی	بدر ماندگان بربخشود می

۳ - ہفت اقلیم (نگارستان فارس صفحہ ۱۶ و ۱۷)

فلک گر بزیر نقاب اندر است	و گر زیر پر عقاب اندراست
مپندار کو از پئے کار تو	به بند خطا و ثواب اندراست
اگر بدکنی کیفر خود بری	نه چشم زمانه بخواب اندراست
برایوانها نام بیژن هنوز	بزندان افراسیاب اندراست

بسے رنج دیدم بسے گفتہ خواندم الخ (مطابق تاریخ گزیدہ)

بیا بگوے که پرویز از زمانه چه برد

برو بپرس که کسریٰ ز روزگار چه خوردرد

گراو گرفت ممالك بدیگران بگذشت

دراین نهاد خزائن بدیگران بسپرد

تاچند نهی بر دل خود غصه ودرد

تا جمع کنی سیم سفید وزر زرد

زان پیش که گردد نفس گرم تو سرد

با دوست بخور که دشمنت خواهد خورد

۴ - منتخب التواریخ (جلد اول صفحہ ۱۰ طبع کلکتہ)

خجسته درگه محمود زابلی دریاست

چگو نه دریا کدآنرا کناره پیدا نیست
شدم بدریا؟ غوطه زدم ندیدم در
گناه بخت من است این گناه دریا نیست

۵ - آتشکده (صفحه ۹۲ - ۹۷ طبع بمبئی) -

ستست همی چشم تو و تیر بدست
بس کس که ز تیر چشم تو نجست
گر پوشدعارضت زره عذرش هست
کز تیر بترسد همه کس خاصه زست

بیا بگوی که پرویز از زمانه چه خورد الخ (مطابق هفت اقلیم)
بسی رنج دیدم الخ (مطابق مذکورهٔ بالا) صرف ۳ شعر
تا چند نہی بر دل خود غصه و درد الخ (مطابق هفت اقلیم)

دوش از سر لطف بنده پروردن خویش
بنمودی طریق مردمی گردن خویش
جرمم همه عفو کرد و دستم بگرفت
خندان خندان فگند در گردن خویش

۶ - مجمع الفصحا (جلد اول صفحه ۳۸۳ - ۳۸۴ طبع ایران)

تہی که چون بدو انگشت در زخیبر کند
برآمد از پے اسلام صد هزار انگشت
علی عالی اعلیٰ که دست قدرت او
هزار ره زده در چشم روزگار انگشت
حکیم گفت کسے را که نجت والا نیست
بہیچ وجه سر او را زمانه جویا نیست
برو مجاور دریا نشین مگر روزی
بدستت افتد دری کجاش همتا نیست

خجسته درگه محمود زابلی دریاست الخ (مطابق منتخب التواریخ)
بیا بگوی که پرویز از زمانه چه خورد والخ (مطابق مذکوره بالا)

دو چیز بر تو بے خطر بینم
کانرا خطراست نزد هره مہتر
دینار چو برنہی بسر بر تاج
در معرکهٔ جان چو بر نہی مغفر

اگر بدانش اندر زمانه لقمان وار
سرای پردهٔ عصمت بر آسمان زدهٔ
وگر زکتب فلاطون‌وارسطاطالیس
هر آنچه هست پسندیده پاك بستدهٔ
اگر سپهبد سیصد هزار شهر شوی
وگر برهمن ششصد هزار بتکدهٔ
به پیش ضربت مرگ این همه ندارد سود
همی بیاید رفتن چنانکه آمدهٔ

'در اظهار تاسف از جوانی و تضمین بیت ابو طاهر المتخلص بخسروانی(۱)'
(مطابق عرفی وغیره)

'از غزلیات اوست'
شبی در برت (مطابق گزیدہ وغیرہ)
اس میں ایک شعر زائد ہے اور 'درماندگان' کی بجائے 'دلدادگان' ہے۔

جمال تو گرزان که من دار می
سجائے تو گر زان که من بود می

'در حضور سلطان محمود بر حسب امر بجهت و سیدن خط ایاز اویماق گفته.

سست همی چشم تو و تیر بدست
بس کس که ز تیر چشم مست تو نخست
گر پوشد عارضت زره عذرش هست
کز تیر بترسد همه کس خاصه ز ست

غم در دل من درآمد و شاد برفت
باز آمد و رخت خویش بنهاد برفت
گفتم به تکلف که زمانی بنشین
بنشست و کنون رفتنش از یاد برفت

تا چند تهی بر دل خود غصه و درد الخ (مطابق هفت اقلیم وغیره)

(۱) ابوطاهرالطیب بن محمدالخسروانی طبیب، شعرائے آل‌سامان میں سے تھا (لباب‌الالباب ج ۲ ص ۳۰)

دوش از سر لطف بنده پروردن خویش الخ (مطابق آتشکدہ)

(ے) دیباچہ شاہنامہ (طبع بمبئی صفحہ ۸ و ۱۶)۔

فردوسی کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ ایک مجلس میں جب کہ تمام درباری شعرا حاضر تھے سلطان محمود نے ایاز کے سبزۂ خط کی تعریف میں رباعی کہنے کی فرمایش کی، شعرا نے فردوسی کی طرف اشارہ کیا ۔ اس نے فی البدیہہ کہا :

مست است بتا چشم تو و تیر بد ست الخ (مطابق مجمع الفصحاء)

سلطان کو یہ رباعی بہت پسند آئی اور اس نے فردوسی کی بہت تعریف کی۔

سلطان محمود کے وزیر احمد بن حسن میمندی اور فردوسی میں مخالفت تھی ، اس وجہ سے فردوسی کے احباب اس کو اس بات کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ اس کی مخالفت ترک کرکے اس کے ساتھ موافقت پیدا کرے مگر فردوسی اس کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا :

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام
سائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز

سوی در وزیر چرا ملتفت شوم
چون فارغم ز بارگہ بادشاہ نیز

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا:

خجستہ درگہ محمود زاولی دریاست الخ

ان کتابوں کے علاوہ بعض لغت کی کتابوں میں بھی فردوسی کے اشعار ملتے ھیں ۔ جو سند میں لائے گئے ھیں۔ مثلاً:

۱ ۔ فرہنگ شعوری :

لغت 'ترک' کی سند میں :

بد و چگونہ وهم کسوتی کہ از شرفش
کلاہ گوشۂ عرش است و ترک شب پوشم

لغت 'دوش' کی سند میں :

بانگک کردست اے بت سیمین
دوش خواندم ترا کہ هستی ذوش

لغت 'گوش' کی سند میں :

پاس می داشتم برائے و بہوش
وز خطاب کنم نیامد گوش

۲ - مجمع الفرس :

لغت 'درغ' کی سند میں :

دل برو سراو نزد مردم نشمردم (کذا)
گفتا که چه سوداست که درغ آب ببرد

لغت ''خلالوش'' کی سند میں :

بر گرد گل سرخ تو خطی بکشیدی
تا خلق جهانرا بخلا لوش فگندی

مگر اسدی طوسی نے اس شعر کو رودکی سے منسوب کیا ہے (۱) اور اس کو اس طرح لکھا ہے :

گرد گل سرخ اندزخطی بکشیدی
سا خلق جهانرا بفگندی بخلالوش

۳ - فرهنگ جہانگیری :

لغت 'سکسک' کی سند میں :

اسپے چنانکه دانی زیرازسیان زیر
از کاهلی که داشت نه سکسک نه راهوار

ان ماخذ کے علاوہ بھی اگر تحقیق کی جائے تو ممکن ہے کہ لغت کی کتابوں اور اشعار کی بیاضوں میں فردوسی کا اور کلام بھی حاصل ہو سکے۔

یہ تمام اشعار جو اوپر نقل کیے گئے ہیں بہت ممکن ہے کہ ان میں بعض اشعار فردوسی کے نہ ہوں، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اکثر حصہ اسی کی تصنیف سے ہے اور اسی کے نام سے تذکروں میں منقول چلا آتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ اشعار فردوسی کے شایان شان ہیں یا نہیں ؟ تو اس زمانے کے طرز سخن کو دیکھتے ہوئے ہم فردوسی کے اس کلام کو معیار سخن سے گرا ہوا نہیں پاتے۔ اگرچہ بعض سخن فہموں کے نزدیک وہ اس قدر و قیمت کا مستحق نہیں ہے جیسا کہ فردوسی کے کلام کو ہونا چاہیے۔ چنانچہ پروفیسر براؤن بھی اس کے متعلق یہی رائے رکھتے تھے، لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن شعرا نے کسی خاص

---

(۱) لغت فرس ص ۵۰ طبع جرمنی۔

صنف نظم میں کمال پیدا کیا ہے ، ان کا دوسرا کلام وہ وقعت اور رتبہ حاصل نہیں کر سکا' یہی وجہ ہے کہ نظامی گنجوی جو مثنویات کے امام مانے گئے ہیں، ان کی غزلیات و قصائد میں وہ رنگ پیدا نہ ہو سکا جو مثنویات میں ان کا امتیازی وصف ہے - بہر حال ہمارے پاس اس وقت فارسی کے ایک قدیم اور نامور شاعر کے کلام کا کچھ حصہ جو اس نے شاہنامہ کے علاوہ لکھا تھاموجود ہے اور اصناف قصیدہ و غزل وغیرہ میں فردوسی کے طرز سخن اور انداز کلام کو ظاہر کر رہا ہے -

ابوالعلا معرّی اور عمر خیام

فارسی کی مثل مشہور ہے کہ ''آدم از آدم رنگ می گیرد''۔ دنیا میں انسانی خیالات کا ارتقا اسی طرح ہوتا رہا ہے ، کہ انسان ایک دوسرے کے افکار و آراء سے استفادہ کرے، اور اپنی قوت اختراع سے اُن کو ترقی دے کر اُن پر اضافہ کرتا رہے۔

انسانی خیالات کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں، کہنے کو یوں سب انسان ہیں مگر بفحوائے ''فضلنا بعضکم علی بعض،، مبدء فیاض سے کسی کو دماغی اور ذہنی قابلیت کم عطا ہوئی ہے اور کسی کو زیادہ، اس لیے ضروری ہے کہ کم استعداد والے اپنے بڑھی ہوئی استعداد والوں سے استفادہ کریں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک خیال کسی وقت کئی آدمیوں کے دماغ میں پیدا ہو، لیکن اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ ہر شخص ایک خیال کو اس طرح کامل طور پر خوبصورتی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا ، جیسا کہ ایک غیر معمولی استعداد کا آدمی ظاہر کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص بعینہ اسی طرح یا کم و بیش اسی ترکیب اور طرز ادا کے ساتھ اس خیال کو ظاہر کرے تو اس پر سرقے کا الزام عائد ہوگا بشرطیکہ یہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ خیال بعینہ کسی متقدم شخص سے ماخوذ ہے۔ لیکن اگر ایسے قرائن موجود نہیں ہیں تو اس پر توارد یا موارده کا اطلاق ہوگا۔ کیونکہ سرقے کا الزام لگانے کے لیے حتمی اور بین ثبوت کا موجود ہونا ضروری ہے جیسا کہ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں:

'سرقہ کا حکم اسی وقت لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ دوسرے نے پہلے سے اخذ کیا ہے۔ اور یہ کہ نظم کرتے وقت اس کو پہلے کا قول یاد تھا۔ یا وہ خود کہے کہ اس نے ایسا کیا

ہے۔ ورنہ ایک کے سابق ہونے اور دوسرے کے اتباع کرنے کا حکم نہ لگایا جائے گا کیونکہ دو سخنوروں کا توارد خاطر یعنی بلا قصد محض اتفاقیہ طور پر جائز ہے مگر جب یہ معلوم نہ ہو کہ دوسرے نے پہلے سے اخذ کیا ہے، تو کہا جائے گا کہ فلاں نے ایسا کہا ہے اور دوسرا اسی بات کو اس سے پہلے اس طرح کر چکا ہے۔ اس طرح صداقت کی فضیلت کو غنیمت جانے اور خود کو علم غیب اور دوسرے کی تنقیص کے دعوے سے محفوظ رکھے(۱)

اس طرح خیالات کا تصادم ہونے سے انسانی خیالات کی یکرنگی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی سخنور کا توارد سے بچنا ناممکن ہے چنانچہ علامہ آزاد بلگراسی فرماتے ہیں:

'اگر کسے بنظر تتمیش ملاحظه کند کم شاعرے را از توارد خالی یابد چه احاطه جمیع معلومات خاصۂ حضرت علم الٰہی است تعالیٰ شانۂ خامۂ سعنی نگار تیرے بتاریکی سی افگند چه داند که صید وارسته است یابال و پربسته' (۲)

ادب اور شاعری کی دنیا میں خیالات کا التقاط یا انتحال بہ نسبت نثر کے نظم میں زیادہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ البتہ احیاناً اگر کوئی مضمون یا خیال بندھ جائے۔ خواہ وہ کسی خیال یا مضمون کے ساتھ ٹکر کھاتا ہو، یا کسی ما قبل ادیب یا شاعر کے کسی خیال خاص کو قصداً لے کر اس کو ترقی دینے اور اس میں بلندی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ اعلیٰ دماغی قابلیت کی ایک دلیل ہوگی، کسی متقدم ادیب یا شاعر کے خیال کا کسی متاخر سے مقابلہ کرنا دنیائے ادب کے فرائض میں داخل ہے۔ تاکہ تحسین کلام کے لیے اس کے ترکیبی عناصر کا تجزیہ کرتے وقت اس پر صحیح طور سے تنقید کی جا سکے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آج کل مغربی تعلیم کی وجہ سے 'مقابلہ' اور 'تنقید' کا فن پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن عربی ادبیات میں یہ فن بہت ترقی کر چکا تھا۔ ادب اور خصوصاً شاعری میں ادبی تنقید کا یہ شعبہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے چنانچہ نقادان سخن نے خاص اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، علاوہ ازیں فنون معانی و بیان، بلاغت اور بدیع

---

(۱) مطول ص ۳۳۳-۳۳۴ مطبوعہ شاہجہانی

(۲) سرو آزاد ص ۶۹ -

کی اکثر کتابوں میں جا بجا اس قسم کی ادبی تنقیدات کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا سردست ہم کو اسلامی دنیا کے دو نامور فلسفی شاعروں کا مقابلہ کرنا ہے، جو ابوالعلاء العمری اور عمر خیام کے نام سے جریدۂ عالم پر اپنی شہرت دوام ثبت کر چکے ہیں۔

معری نے سنہ ۴۴۹ھ میں وفات پائی ہے(۱) ۔ اور خیام کا سال ولادت ۴۱۰ھ اور ۵۱۷ھ سال وفات ہے (۲)۔ اس لحاظ سے دونوں ہمعصر تھے ۔ کیونکہ معری کی وفات کے وقت خیام کی عمر ۳۹ سال کی ہوئی ہے ۔اول الذکر سلکشام میں گذرا ہے اور دوسرا خراسان میں اور یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ اس زمانے میں ابوالعلاء کی شہرت عراق اور شام میں پھیل چکی تھی، جیسا کہ معری کے ایک سوانح نگار کا بیان ہے کہ:

'معرہ سے لے کر ٹھیٹھ اندلس کے اندرونی حصوں اور خراسان کی انتہائی حدود تک ان کی شہرت پھیل گئی'(۳) ۔

اس لیے قرین قیاس ہے کہ خیام کو ابوالعلاء کے عین حیات میں یا اس کی وفات کے بعد اس کا کلام پہنچا ہو، اور اس طرح سقط الزند اور زوسیاتمعری کا اثر رباعیات خیام پر بلا واسطہ پڑا ہو۔

معری اور خیام کے مقابلے کا خیال مستشرقین میں سب سے پہلے فرانسیسیمستشرق سالمون کو ہوا ، جس نے ابوالعلاء پر ایک کتاب فرنچ میں لکھیہے ۔اس کتاب کا نام ''نابینا شاعر'' (LEPOETEAVEGLE)ہے ۔ اور ۱۹۰۴ء میں پیرس میں شائع ہوئی ہے ۔ اس میں مصنف نے معری کو خیام کا 'پیشرو' (PRECURSORY) بتایا ہے۔ سالمون کا خیال ہے کہ معری نے 'شراب ارغوانی' کی جو تعریف کی ہے ۔اس میں عمر خیام اس کا ہمزبان ہے(۴) ۔ لیکن یہ صریحاً غلط ہے ۔ اور اسی لیے پروفیسر نیکلسن اس بنا پر اس کو نہیں

---

(۱) ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۴ ۔

(۲) خیام کی تاریخ ولادت و وفات میں مورخین کا اختلاف ہے۔ لیکن معتبر مآخذ کی بنا پر اس کا سن ولادت ۴۱۰ اور تاریخ وفات ۵۰۸ھ سے ۵۳۰ھ کے مابین مقرر کی گئی ہے ۔ (دیکھو مجمع الفصحاء اور چہار مقالہ) ۔

(۳) ابوالعلاء ومااليہ ص ۲۰۲ طبع سلفیہ مصر۔

(۴) سالمون کی کتاب ص ۴۰ ۔

تسلیم کرتا، کہ معری نے جہاں کہیں شراب کا ذکر کیا ہے وہاں نفرت کے ساتھ کیا ہے تاہم وہ لکھتا ہے کہ:

'اگر وہ مان لیا جائے کہ خیام (اپنے خیالات میں) معری سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خیام کی رباعیات کے انگریزی تراجم میں دونوں شاعروں کا مقابلہ کرنے کے لیے معتبر شہادت بہت ناکافی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ دونوں کی فلسفیانہ زندگی کے بعض خط و خال مشترک ہیں۔ اور لزومیات معری میں کئی مقامات ایسے ہیں جو خیام کی بعض رباعیات کو یاد دلاتے ہیں' (۱)

سالمون کے بعد دوسرا نمبر امین ریحانی کا ہے، جو شام کا ایک مشہور عیسائی مصنف اور ادیب ہے۔جس نے معری کے بعض اشعار کا انگریزی ترجمہ کرکے رباعیات ابوالعلاء (QUATRAINS OF ABULALA) کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس نے معری کے اشعار کے مقابلے میں خیام کی چند رباعیاں بھی (انگریزی ترجمہ)نقل کی ہیں۔ جن میں خیالات کا اتحاد ہے اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر اس نے خیام کو معری کا پیرو بتایا ہے۔

چنانچہ دیباچے میں رقمطراز ہے:

''میں اس مشابہت کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو عمر خیام اور ابوالعلاءالمعری کے خیالات میں پائی جاتی ہے۔ میں بدلائل اس بات کو مانتا ہوں کہ خیام معری کا مقلد یا شاگرد تھا۔ خیام کی ولادت اور معری کی وفات میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں گیارہویں صدی کے وسط میں گذرے ہیں (۲)

لیکن اس مشابہت اور مماثلت کے باوجود امین ریحانی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ خیالات خیام نے معری سے سرقہ کیے ہیں۔ چنانچہ لکھتا ہے:

'میں یہ نہیں کہتا کہ خیام نے سرقہ کیا ہے۔ میرا مطلب صرف یہی ہے کہ اس نے اپنے کئی ملحدانہ اور آزادانہ خیالات ابوالعلاء سے حاصل کیے ہیں' (۳)

مصر کا عیسائی ادیب ودیع البستانی جس نے رباعیات خیام کا عربی میں

---

(۱) اسٹڈیزان اسلامک پوئٹری ص۹ ۲۰، ۲۰۶ -

(۲) رباعیات ابوالعلاء، صفحہ ۱۸، ۱۹ دیباچہ۔

(۳) ایضاً صفحہ ۱۹ -

ترجمہ کیا ہے ' وہ بھی ریحانی کی رائے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ خیام نے معری کے خیالات سے سرقہ کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

'اور ایسا کہنے والے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خیام کی رباعیات معری کے لزومیات کے طرز پر گڑھی ہوئی ہیں۔ نیز یہ کہ خیام اپنے خیالات کے لحاظ سے معری کا شاگرد ہے۔ اور اس کی آراء میں اس کا پیرو ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان دونوں کے اقوال میں بہت قریبی مشابہت بکثرت اور واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ اور اس لیے اس کا احتمال صاف ظاہر ہے کیونکہ خیام عربی زبان؛ اس کے علوم، و آداب میں کامل دستگاہ رکھتا تھا بلکہ اس زبان میں کتابیں لکھتا اور شعر کہتا تھا لیکن اس بنا پر ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس فارسی شاعر پر عربی شاعر کے خیالات سے سرقہ کرنے کا الزام لگائیں۔ کیونکہ ان دونوں میں جو بات مشترک ہے ' وہ حقائق کی تصویر اور عقلی دلائل و براہین ہیں۔ جو شعری قالب میں رنگے ہوئے ہیں۔ اور استعارات و کنایات اور خیال آرائی کے اقسام میں سے نہیں ہیں کہ جس کا فخر اس کے موجد اور متقدم کو ہو سکتا ہے۔ اور جب ہم نے تقدم اور تاخر زمانی کے اعتبار سے حکم لگانے پر اکتفا کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اس کے بغیر بھی چارہ نہ ہوگا کہ ہم معری کو اس کی فضیلت سے معریٰ کر دیں۔ اور اس پر بھی اس سے پہلے کے فلاسفہ یونان و روم سے اخذ کرنے کا اتہام لگائیں'(۱)

لزومیات معری اور رباعیات خیام کے مابین جو امور مشترک ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ دونوں کا موضوع سخن حکمت و اخلاق کی تعلیم دینا ہے۔
۲۔ دونوں دنیا کی آرائیشوں اور زیبائیشوں سے بیزار ہیں اور زھدو ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔
۳۔ دونوں حکمائے یونان کے افکار و آراء سے متاثر ہیں۔
۴ دونوں مذہب کو عقل کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں،
۵ بعض مذہبی اعتقادات کی نسبت ملحدانہ اور آزادانہ خیالات کے اظہار میں دونوں ہم آہنگ ہیں،

---

(۱) مقدمۂ رباعیات عربی ص ۱۲، ۱۳۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رباعیات خیام میں جابجا وہی روح دائر و سائر نظر آتی ہے، جو لزومیات معری کے قریب قریب ہر صفحے پر نمایاں ہے لیکن کوئی حتمی ثبوت ایسا موجود نہیں ہے، جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ خیام نے معری کے کلام سے براہ راست اخذ کیا ہے، تذکرۂ خیام کے معتبر ماخذ میں سے قاضی اکرم بن القفطی کی تاریخ الحکماء ہے، اس میں خیام کی نسبت لکھا ہے:

'خراسان کا امام اور اپنے زمانے کا علامہ ہے، یونانیوں کا علم جانتا ہے، اور جسمانی حرکات کی پاکیزگی سے نفس انسانی کی صفائی کے ذریعہ خدائے واحد (و جزا دہندہ) کو طلب کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اور یونانیوں کے قواعد کے مطابق سیاست مدن کے التزام کا حکم دیتا ہے' (۱)

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے، کہ خیام علوم یونان کا عالم اور فلسفہ و حکمت کا بہت بڑا ماہر تھا، اور غالباً یہی وجہ تھی جس نے اس کو دوسرے فلاسفہ کی طرح مذہب کی نسبت آزاد خیال بنایا تھا، اس لیے بقول بستانی 'بجائے اسکے کہ ہم خیام کے فلسفیانہ خیالات و آراء کو لزومیات معری سے ماخوذ ثابت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ان کو جمہوریت افلاطون سے منسوب کردیں' (۲)

ایک بات یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے، کہ اگر خیام نے اپنے افکار و آراء کی بنیاد معری کے کلام پر رکھی ہوتی، تو کم از کم تذکرہ نویس اور مورخین ضرور اس کی طرف اشارہ کرتے، خصوصاً قفطی ایسا متجسس اور فلسفی مزاج مؤرخ جو دونوں کے حالات سے با خبر تھا، اس کا ذکر کیے بغیر نہ رہتا،

بہرحال خیام اور معری کے بعض کلام میں جو مماثلت قریبہ پائی جاتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا' یہاں دونوں شاعروں کے وہ اشعار نقل کرتے ہیں جن میں مشترک خیالات پائے جاتے ہیں:

(۱) معری

غیر مجد فی ملتی و اعتقادی	میرے مذہب اور عقیدے میں رونے والے کا
نوح باك و لا ترنم شاد	نوحہ اور گانے والے کا ترنم دونوں میں

۱۔ تاریخ الحکماء صفحہ ۲۴۳ طبع جرمنی، یہاں قواعد یونانیہ سے کون و حیاۃ اور معاشرت و اخلاق کی نسبت فلاسفۂ یونان کے نظریات مراد ہیں (۲) مقدمۂ رباعیات عربی صفحہ ۱۴،

أبكت تلكم الحمامة ام غز
نت على فرع غصنها المياد (۱)

کوئی بزرگی نہیں ہے، خواہ وہ کبوتر روتے ہوں یا اس (درخت) کی ٹوٹی ہوئی ڈالی پر بیٹھ کر گا رہے ہوں،

خیام :

آنرا کہ وقوفست بر احوال جہان   شادی و غم و رنج بردشدیکسان
چون نیک‌وبد جہان بسر خواهد شد   خواہی تو بدرد باش خواہی درمان

ایک فلسفی کی نظر میں 'نوحۂ غم' اور نغمۂ شادی یکساں ہوتے ہیں، جیسا کہ مرزا غالب اسی خیال میں ایک خاص نتیجہ پیدا کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی!

(۲) معری :

خفف الوطأ ما اظن ادرمارد
ارض الا من هذه الاجساد
و قبیح بناوان قدم العـهد
دهوان الآباء والاجـداد (۲)

قدم آہستہ رکھ کیونکہ میرے خیال میں زمین کی جلد (سطح) انھی اجسام سے بنی ہے، اور یہ ہمارے لیے بہت بری بات ہے، خواہ ہمارے آبا و اجداد کو گئے ہوئے ایک زمانہ گذر چکا ہو،

ایک اور جگہ کہتا ہے :

عجباً لنا ولمن مضىل اقدامنا   يمشين فوق جسومهم والاروس

ہمیں تعجب ہوتا ہے اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو گذر چکے ہیں، کہ ہمارے قدم ان کے جسموں اور سروں پر چلتے ہیں !

ولسوف يفعلهٔ بناسن بدنا   ان المنون سهامها فی الاقوس(۳)

اور قریب ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بھی یہی سلوک کرے کیونکہ اجل کے تیر اس کی کمانوں میں رکھے ہوئے ہیں،

خیام :

ہر سبزہ کہ بر کنار جوئے رستست   گوئی ز لب فرشتہ خوئے رستست
ہان بر سرسبزہ پا بخواری نہ نہی   کان سبزہ بخاک لالہ روئے رستست

---

(۱) سقط الزند ص ۸۱ مطبع ہندیہ مصر، (۲) سقط الزند ص ۸۲،
(۳) لزومیات جلد ۲ ص ۳۲

قریب قریب اسی خیال کی ایک جھلک مرزا غالب کے اس شعر میں پائی جاتی ہے :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

(۳) معری :

یا روح کم تحملین الجسم لاهیة
ابلیة فاطرحیه طالما لبسا
ان کنت آثرت سکناه فمخطئة
فیما فعلت وکم من ضاحك عیسا(۲)

اے روح کب تک ہنسی خوشی سے اس جسم کو اٹھائے رہے گی، تو نے اس کو بوسیدہ کردیا ہے۔ اسے اتار پھینک کہ اس کو پہنے ہوئے زمانہ گذر گیا، اگر تو نے اسی میں رہنا پسند کیا ہے، تو تو نے بڑی خطا کی ہے اور کئی ہنسنے والے ہیں جو (آخر کو) خشک اور ستین چہرہ بنا لیتے ہیں،

خیام :

اے دل ز غبار جسم اگر پاک شوی
تو روح مجردی بر افلاک شوی
عرش است نشیمن تو شرمت بادا
کائی و مقیم خطۂ خاک شوی

(۴) معری :

عبوبی ان بنألت‌بها کثیر
وای الناس لیس له عیوب
وللانسان ظاهر سایراو
ولیس‌علیه‌ماتخفی‌الغیوب(۲)

اگر تم پوچھتے ہو تو مجھ میں بکثرت عیوب موجود ہیں۔ اور کون ایسا ہے جس میں عیوب نہیں ہیں۔ انسان کا ایک ظاہر ہے جسے وہ دکھا سکتا ہے۔ لیکن جو باتیں کہ اس میں پوشیدہ ہیں ان کو وہ نہیں دکھا سکتا۔

خیام :

ناکردہ گناہ در جہان کیست بگو
آنکس کہ گنہ نہ کرد چون زیست بگو

(۵) معری :

خذالان فیما نحن فیه‌وخلیا
غداً فحولم یقدم واسرفقدسرا(۳)

موجودہ وقت کہ جس میں ہم ہیں۔ لے لے اور فردا کو جو ابھی نہیں آیا اور دیروز کو جو گذر گیا چھوڑ دے۔

---

(۱) لزومیات جلد ۲ ص ۲۷

(۲) لزومیات جلد ۱ ص۳۷، ۴۷

(۳) ایضاً ص ۲۸۸ -

خیام :

روزے کہ گذشت او دگر یاد مکن — فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
برنامدہ و گذشتہ بنیاد منہ — حالے خوش باش و عمر برباد مکن

(٦) معری:

هفت الحنیفة والنصارىٰ ما اهتدت — دین حنیفی والے بھٹک گئے اور
و یهود حارت والمجوس مضللة — نصاریٰ ہدایت یاب نہ ہوئے یہودی
اثنان اهل الارض ذو عقل بلا — حیران رہ گئے اور مجوس گمراہ ہو گئے
دین و آخر دین لا عقل له (١) — اہل دنیا دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ
جو عقل رکھتے ہیں مگر دین نہیں
رکھتے اور دوسرے وہ جو دین رکھتے
ہیں مگر عقل نہیں رکھتے۔

خیام :

جمعے متفکر اندرمذهب و دین — جمعے متحیر اندرشک‌ویقین
ناگاه منادیٔ برآید زکمین — کاے بے خبران راه نه آن‌است‌نه‌این

ہمارے فارسی اور عربی شعراء کی قدیم محبوبہ 'بنت العنب' ہر وقت ان کے لباس شعری میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے اور خیام کی بادہ پرستی کی شہرت تو ایشیا اور یورپ کے ہر ایک گوشے میں پہنچ چکی ہے۔لیکن جہاں معری اور خیام کی فلسفیانہ زندگیاں اپنی مشابہت کی وجہ سے متعدد امور میں مشترک ہیں ، وہاں شراب کے متعلق ان دونوں کے خیالات میں پورا تضاد پایا جاتا ہے۔ شراب کا ذکر ابوالعلاء نے بھی کیا ہے اور بار بار کیا ہے۔ مگر اسی طرح جیسا کہ عہد حاضر کے مشہور امریکن 'مانع المسکرات' (PROHIBITIONIST) جان پسی فوٹ (JOHN PUSSY FOOT) نے کیا ہے۔معری کا بکرات و مرات مختلف عقلی اور اخلاقی خرابیوں کی بنا پر 'دختررز' سے محترز رہنے کی ہدایت کرنا اس قدر اہم ہے کہ وہ ایک علحدہ مضمون کا محتاج ہے۔ بہر حال معری سا 'انگور کی بیٹی' کا ''عدوے ازرق'' بھی آلام و مصائب دنیوی کو فراموش کر دینے کے لیے آرزو کرتا ہے کہ کاش شراب صرف مدہوشی کے لیے جائز ہوتی! چنانچہ کہتا ہے :

(٧) تمنیت ان الخمر حلت نشوة — میری آرزو تھی کہ شراب صرف نشہ

---

(١) لزومیات جلد ٢ ص ١٧٥ -

تجھلئی کیف اطمانت بی الحال(۱)

لانے کے لئے جائز ہوتی تاکہ وہ مجھے اس بات کو بھلا دیتی کہ مجھ پر کیا گذری۔

ایک اور جگہ کہتا ہے :

أیأتی نبی یجعل الخم طلقة
فتحمل شیئاسن هموبی واحزانی(۲)

کیا اب کوئی نبی آنے والا ہے جو شراب کو حلال کر دے تاکہ وہ میرے رنج و غم کا کچھ حصہ دور کر دے۔

اسی معنی میں خیام کہتا ہے :

اے رب بکشائے برمن از رزق درے
بے منت مخلوق رسان ما حضرے

از بادہ چنان مست نگه دار مرا
کز بے خبری نبا شدم درد سرے

اسی خیال کو مرزا غالب نے اس طرح باندھا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

(۸) ارواحنامضا و لیس لنابها
علم فکیف اذاحوتها الاقبر(۳)

ہماری روحیں ہمارے ساتھ ہیں پھر بھی ہمیں ان کا علم نہیں ہے تو جبکہ ارواح کو قبریں گھیر لیں گی اس وقت کیا معلوم ہو گا۔

خیام :

دل سر حیات اگر کما ھی دانست
در موت ھم اسرار الهی دانست

امروز که با خودی ندانستی هیچ
فردا که زخود روی چه خواهی دانست

ان چند مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ معری کے فلسفیانہ خیالات کا اثر خیام کی رباعیات میں کس قدر پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خیالات کے توارد اور تخیل کی یکرنگی کی بنا پر بعض جگہ سرقے کا دھوکا ہوتا ہے۔

ان اشعار کے علاوہ بھی معری اور خیام کے موضوعات کلام میں بکثرت اشتراک پایا جاتا ہے۔ مثلاً دنیا کی بے ثباتی، جبریت، اخلاقی تعلیم، فقہا اور واعظین کی خدمت، حشر و نشر کا انکار، مذہبی آزاد خیالی وغیرہ، فرق صرف

---

(۱) سقط الزند ص ۱۰۳ -
(۲) لزومیات جلد ۳ ص ۳۰۶ -
(۳) لزومیات جلد اول ۲۶۳ -

اس قدر ہے کہ معری صاف صاف ملحدانہ بولی بولتا ہے ۔ اور خیام دبی زبان سے لیکن زیر لب تبسم کے ساتھ اشارات و کنایات میں گفتگو کرتا ہے ۔

انشاءاللہ آیندہ ہم دونوں کے مشترک خیالات کا مقابلہ کریں گے اور دکھائیں گے کہ دونوں فلسفی شاعروں کے کلام میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے ۔

شعرائے عجم کی عربی شاعری

عربی زبان اور اہل عجم

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عربی زبان ہی صرف ایسی زبان تھی۔ جو اس وقت تمام ممالک اسلامیہ میں اظہار خیال کا بہترین آلہ سمجھی جاتی تھی (۱) ۔چنانچہ چوتھی صدی ہجری تک عربی تمام اسلامی دنیا کی علمی زبان بنی ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی تقریباً ساتویں صدی میں حملۂ تاتار تک اسی ایک زبان میں علمی تصانیف لکھی جاتی تھیں(۲)۔اس لحاظ سے عالم اسلامی کے طول و عرض میں عربی زبان کا وہی علمی درجہ تھا جو لاطینی زبان کو ازمنہ وسطیٰ کے یورپ میں حاصل تھا۔ اور گو عام طور پر عربی زبان بول چال اور روز مرہ گفتگو میں استعمال نہ کی جاتی ہو، لیکن مدارس اور دارالعلوموں میں اسی زبان میں نوشت و خواند ہوتی تھی۔ عربی زبان کا یہ رنگ گو کچھ عرصے تک قومی اور ملکی اثرات کی وجہ سے کچھ پھیکا پڑ گیا لیکن عام طور پر اہل عجم اس سے دست بردار نہ ہو سکے اور کیسے ہو سکتے تھے جب کہ مدتوں تک تحصیل علم کے لیے عربی زبان ذریعۂ تعلیم بنی ہوئی تھی۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان بے شمار فارسی شعراء میں جو لوگ علوم نقلیہ اور عقلیہ میں دستگاہ رکھتے تھے ان کا کلام عربی کی اصطلاحات، محاورات، ضرب الامثال اور تلمیحات سے لبریز ہے۔

عربی شاعری کی تقلید

اہل ایران میں اگرچہ فارسی شاعری کی ابتدا تیسری صدی میں ہو چکی تھی (۳) اور اسی وقت سے گو عام طور پر عجمی شعراء فارسی

---

(۱) تاریخ ادبیات ایران از پروفیسر براؤن جلد دوم ص ۴ تا ۸ ۔

(۲) تاریخ ادب العرب از نیکلسن ص ۲۷۷ ۔

(۳) ادبیات ایران جلد اول ص ۱۳ ۔

شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے ۔ لیکن عربی زبان کے ادب اور شاعری نے زمانے تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا ۔ اس لیے اگر ایک طرف وہ اپنی مادری زبان میں شعر کہتے تھے تو دوسری طرف عربی شعراء کے دوا وین بھی ان کے پیش نظر رہتے تھے اور وہ ان سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے ۔ بلکہ ایک حد تک یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عربی شاعری پر انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔عجمی شاعری کے فاضل مورخ کا بیان ہے کہ :

'اول اول ایرانی شعراء عربی شاعری سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے ۔ مشق کی ابتدا یہ تھی کہ عربی اشعار کا ترجمہ لفظی کرتے تھے ۔ آج بہت سے فارسی قطعے فرد بلکہ قصیدے موجود ہیں جن کو عام لوگ ایران کا سرمایہ سمجھتے ہیں ۔ لیکن در حقیقت وہ عربی اشعار کے ترجمے ہیں ۔ اور مترجموں نے دانستہ ترجمہ کیا ہے تاکہ شعراء کے لیے نمونے ہاتھ آئیں' (۱)

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اشعار عرب کے پورے مضامین تک اڑا لیے گئے اور ان کو فارسی کے حجاب میں ایسا مستور بنا دیا ۔ کہ عربی ادب سے ناواقف لوگ ان کا عربی جلوہ نہ دیکھ سکے ۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں :

'اس پردے میں سرقہ شروع ہو گیا عنصری، اسدی، کسائی، مروزی، اغضائری کے ہاں بہت سے مضامین ہیں جو قطعاً عرب سے لیے ہیں ۔ لیکن چونکہ لوگوں کی نظر کلام عرب پر نہیں ہے ۔ اس لیے کسی نے سرقہ یا ترجمہ کا خیال نہیں کیا' (۲)

عجم کے نامور شعراء باین ہمہ بلند پروازی اور علو فکر کے عربی شاعری کی فضیلت اور عربی شعراء کی قدر و منزلت سے منہ نہیں موڑ سکے ۔ بلکہ ہر موقع پر ان کو اعتراف ہی کرتے بنا ہے کہ شاعری میں ان کے استاد عرب تھے ۔ چنانچہ انوری لکھتا ہے:

شاعری دانی که امی قوم کردند آنکه بود
اول شان امراء القیس آخر شان بو نواس (۳)

عربی شاعری میں شعرائے عجم کا حصہ : فارسی اور ایرانی شعرا نے عربی

---

(۱) شعرالعجم جلد چہارم ص ۱۲۱۔
(۲) ایضاً ص ۱۲۴ ۔
(۳) شعرالعجم ص ۵۱۳-۵۱۴

شاعری میں اپنا جو حصہ پیش کیا ہے ، وہ بجائے خود ایک دلچسپ اور مستقل موضوع ہے جس پر اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے اور جس پر پروفیسر براؤن ان الفاظ میں اظہار تعجب کرتے ہیں :

'میں اس بات پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ لوگ جنھیں فارسی ادبیات سے دلچسپی ہے (بشرطیکہ وہ ادبیات کو محض اظہار زبان دانی سمجھتے ہوں) کہ کسی قوم کی دماغی اور ذہنی پیداوار انھوں نے ایسے موضوع پر مطالعے کے ایسے وسیع میدان کو اب تک کیوں نظر انداز کر رکھا ہوگا ؟ رہے وہ لوگ جنھیں تمام تر عربوں اور دیگر جماطیقی اقوام سے سروکار ہے تو وہ طبعاً یہ زحمت گوارا نہ کریں گے' (۱)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :

'فاعدے کی بات ہے کہ عربی کے ادیب کے لیے یہ موضوع کچھ زیادہ دلچسپ اور قابل توجہ نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے قدرتی طور پر وہ اس کی طرف مائل نہیں ہوتا گو وہ اس کو کلاسیکل بھی خیال کرتا ہو ۔ جب کہ ادب فارسی کا محقق بہت دیر میں جا کر اس امر کی تصدیق کرے گا کہ تاریخی اور ادبی مقصد کے لیے لسانیات کا نقطۂ نظر بہت گمراہ کن ہو ۔ یعنی کہ سنسکرت اور آرین زبانوں سے آسے اس قدر سروکار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ عربی سے' (۲)

پروفیسر براؤن کا یہ قول صحیح ہے کہ فارسی کے مصنفین ادب نے اس میدان میں گام رسانی نہیں کی لیکن عربی کے بعض ادیبوں نے اپنی قابل قدر تصانیف میں اس موضوع .... اکٹھا کر دیا ہے ۔ چنانچہ ثعالبی نے یتیمہ الدھر میں اور باخرزی نے دمیۃ القدر میں بعض ان عجمی شعرا کا کلام درج کیا ہے جن کو ذواللسانین (دو زبانوں میں شعر کہنے والے) کہتے ہیں ۔ لیکن ان کی یہ تصانیف ان کی ذاتی معلومات و واقفیت کے لحاظ سے ایک حد تک محدود ہیں ' کہ ان میں سے اول الذکر صرف چوتھی صدی اور اس سے پہلے اور ثانی الذکر چھٹی صدی اور اس سے پہلے کے شعراء کا تذکرہ ہے جن میں بعض

---

(۱) لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول ص ۴۴۴

(۲) ایضاً ایضاً ص ۴۷۷

فارسی گو شعرائے عجم کا عربی کلام نقل کیا گیا ہے، لیکن متعدد مشاہیر شعرائے عجم کا عربی کلام زیادہ تر ان کے فارسی کلام کے مجموعوں اور دواوین کے سوا کہیں نہیں ملتا۔ان کے بعد دسویں صدی ہجری میں ابن معصوم نے سلافتہ العصر جیسی ضخیم کتاب لکھ کر بعض متاخرین شعرائے عجم کے عربی کلام کے نمونے پیش کیے ہیں ۔مگر وہ بقول مصنف صرف دسویں صدی کے شعراء تک محدود ہے(۱) یہی وجہ ہے کہ ان عربی تذکروں میں ہم اُن مشاہیر فارسی شعراء کا کلام نہیں پاتے جو فلک شاعری کے درخشاں ستارے مانے گئے ہیں اور جنھوں نے بہ نسبت عربی کے فارسی میں زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

عجمی شعراء کا کلام صحیح طور پر عربی نہیں ھے عجمی شعراء کا عربی کلام طرز ادا اور اسلوب بیان کے لحاظ سے عجمی ہے اور گو محاورات اور زبان کے لحاظ سے وہ صحیح عربی ہو، لیکن یہ ان ٹھیٹھ عربی خصوصیات سے معریٰ ہے جو عرب کے شعرائے متقدمین کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے ان متاخرین کی عربی شاعری کو نقادان فن عربی نہیں کہتے (۲) - پروفیسر براؤن لکھتے ہیں :

'بحیثیت زبان و محاورات کے وہ قریب قریب ''عربی'' ہی ہے' گو وہ اس سطح شاعری کو نہ پہنچا ہو جو ان ممالک میں پیدا ہوئی جہاں عربی مادری زبان تھی(۳)' -

علامہ ابن خلدون جنھوں نے اپنے مقدمہ تاریخ میں ملکۂ لسانی کے نظریہ پر بحث کی ہے، اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اہل عجم عربی کے ملکہ لسانی سے بہت دور جا پڑے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :

"اوریہ ملکہ لسانی اس عہد (عباسی) میں بہت پختہ تھا اور مشرق میں جید شعراء اور انشا پردازوں کی کثرت عربوں اور ان کی اولاد کی کثرت کی وجہ سے تھی اور مشرق میں یہ ملکہ بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت میں بہت مضبوطی کے ساتھ قائم رہا ۔ اس وقت ان میں ایسے لوگ تھے جو بلاغت میں عرب جاہلیت سے بڑھے ہوئے تھے ۔ جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے یہاں تک کہ عربوں

---

(۱) سلافتہ العصرفی محاسن الشعراء مصر ص ۹
(۲) شعرالعجم جلد اول ص ۹۷
(۳) لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد اول ص ۳۷۲

کی حکومت مٹنے کے ساتھ ہی ان کی زبان بھی مٹ گئی، اور ان کا کلام بگڑ گیا۔ ان کی سلطنت عجمیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ غالب ہو گئے۔یہ دیلمیوں اور سلجوقیوں کے عہد حکومت میں ہوا اور اہل شہر اور متمدن لوگوں سے ان کا میل جول ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ عربی زبان اور اس کے ملکہ سے دور جا پڑے۔ اور ان کے متعلم اس زبان کی تحصیل سے قاصر رہے، اور اس زمانے میں فن نظم و نثر میں ہم ان کی زبان کو ایسا ہی پاتے ہیں ۔ اگرچہ ان دونوں فنون میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے'۔ (۱)

اس کے ساتھ ہی ابن خلدون کی یہ رائے بھی ہے کہ 'ایک عجمی جو شروع ہی سے فارسی زبان میں دستگاہ رکھتا ہے، وہ عربی زبان کے ملکہ پر قادر نہیں ہوسکتا، (۲)

قدیم اور جدید شاعری

یہی وجہ ہے کہ شعر عرب کے ناقدین، متاخرین شعراء (جن میں اکثر اہل عجم ہیں)، کی عربی شاعری کو کلاسیکل نہیں مانتے، اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے قدیم اور جدید شاعری کے فرق اور امتیاز کی وجوہ معلوم کرنا ضروری ہیں،

اسلام کی ابتدائی صدیوں کے بعض نقادان سخن کے نزدیک، جو زیادہ تر زباندان ہوتے تھے، اصلی شاعری صرف شعرائے جاہلیت کی کہی جاسکتی ہے، بلکہ ان کے خیال میں کسی شاعر کا بعد از اسلام پیدا ہونا ہی نقص شاعری کی دلیل تھی، چنانچہ ابو عمرو بن العلا نے اخطل کی نسبت کہا تھا کہ اگر اس نے عہد جاہلیت میں ایک دن بھی بسر کیا ہوتا تو میں کسی شاعر کو اس پر ترجیح نہ دیتا، (۳) یہ صحیح ہے کہ اس زمانے کے ناقدین اور زباندانوں کے حلقوں میں یہ خیالات جاگزیں ہوگئے تھے، اور ان کا اثر عام مذاق سخن پر بھی اس حد تک پڑچکا تھا، کہ عروض اور نحو کے ماہرین جس شاعر کے کلام پر چاہتے، اعتراض جڑ دیتے، اور اس کو غیر عربی ٹھرا دیتے تھے، ان کے نزدیک بدویانہ زندگی کی تصویر نظم میں کھینچنا ہی کمال شاعری کی معراج سمجھا جانا تھا، اسی بنا پر ابن خلدون نے

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۵۱۴، ۵۵۲ طبع بولاق

(۲) ایضاً ص ۵۶۵،

(۳) کتاب الاغانی جلد اول ص ۱۶۸،

شعرائے مولدین مثلاً متنبی اور ابوالعلاءالمعری وغیرہ کے کلام کو 'کلاسیکل' نہیں مانا، کیونکہ وہ اسالیب عرب پر نہیں ہے، (۱) مگر بعضوں نے اس ''قدامت پسندی'' سے اعراض کرکے اس رسمی پابندی کو لغو قرار دیا تھا، چنانچہ مشہور عربی شاعر ابو نواس باوجود قدیم عربی شاعری کے اسلوب کا پابند ہونے اس کو ترک کر دینے کی استدعا اس لطیف پیرائے میں کرتا ہے :

صفة الطلول بلاغة القدم
فاجعل صفاتك لابنة الكرم
ولا تخدع عن عن النى جعلت
سقم الصحيح وصحة السقم
تصف الطلول على السماع بها
افذو العيان كأنت فى الحكم
و اذا وصفت الشئ متبعاً
لم تخل من غلط ومن وهم(۲)

کھنڈروں کی تعریف کرنا یہ قدیم شعر کی بلاغت ہے، اب تم دختر انگور کی تعریف بیان کرو اور ہرگز اس سے فریب بازی نہ کرو جو تندرست کی بیماری اور بیمار کی تندرستی ہے، تم محض سن سن کر کھنڈروں کی تعریف کر رہے ہو گویا تم نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، لیکن محض تقلیداً کسی چیز کی تعریف کروگے تو وہ غلطی اور توہم سے خالی نہ ہوگی،

اسی طرح بعض منصف مزاج ماہرین فن نے بھی اصل عربی شاعری کے اس معیار کو ضروری نہیں سمجھا، بلکہ شعر کی خوبیوں کو بندش، طرز ادا، اور نفاست خیال پر منحصر کردیا، چنانچہ تیسری صدی کے ایک مشہور ادیب اور مورخ ابن قتیبہ اپنے زمانے کے نقادان سخن کے عام مذاق کے خلاف لکھتے ہیں :

'میں نے اپنے زمانے کے علماء کو دیکھا ہے کہ وہ ایک پست شعر کو شاعر کے تقدم زمانی کے لحاظ سے بلند کہہ دیتے ہیں، اور اس کو اپنے پسندیدہ کلام میں شمار کرتے ہیں، اور بلند شعر کو پست ٹھہرا دیتے ہیں جس کا عیب صرف یہ ہے کہ وہ ان کے زمانے میں کہا گیا ہے، اور انھوں نے اس کے قائل کو دیکھا ہے مگر خداوند تعالیٰ نے فن شعر، فہم اور بلاغۃ کو کسی خاص عہد کے ساتھ مخصوص نہیں کردیا، بلکہ اپنے بندوں میں مشترک طور پر تقسیم کیا ہے، اور ان کی ہر قدیم چیز کو اس

---

(۱) مقدمہ ص ۵۶۹، (۲) العمدة لابن رشیق، جلد اول ص ۵۸،

کے زمانے میں جدید بنایا ہے، اور بہترین چیز کو اس کے ابتدائی زمانے میں خارج (غیر مروج) ٹھہرایا ہے، (۱)

ابن قتیبہ نے شاعری کا اعلیٰ معیار صرف 'حسن کلام' کو قرار دیا ہے، لیکن بعض ناقدین قدیم شعرائے جاہلیت پر شعرائے مخضرمین اور ابتدائی عہد اسلام کے شاعروں کو ترجیح دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ صحیفۂ آسمانی اور حدیث نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی معجزانہ فصاحت و بلاغت سے واقف ہوچکے تھے، جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں صفائی اور روانی پیدا ہوگئی تھی، اسی لیے ان کے نزدیک شعرائے مخضرمین حضرت حسان بن ثابت، عمر بن ابی ربیعہ، حطیۃ، جریر، فرزوق، نصیب، غیلان، ذوالرمۃ، احوص اور بشار بن بروکا کلام شعرائے جاہلیت پر سبقت لے گیا ہے، (۲) اس سے آگے بڑھ کر بعض نقاد یہاں تک مانتے ہیں کہ شعرائے مولدین سلاست اور صفائی میں متقدمین پر سبقت لے گئے ہیں، چنانچہ اندلس کا نامور شاعر اور نقاد ابن رشیق لکھتا ہے، کہ مولدین کا کلام شیریں بیانی، روانی، حلاوت اور سلاست کی وجہ سے زیادہ پڑھا جاتا ہے، اور متاخرین بھی متقدمین کے مسلک پر چلتے یعنی ان کے اشعار کے تتبع میں صحرا، چوپایوں اور حشرات الارض کا ذکر کرتے تو ان کا کلام اس‌قدر مطبوع طبع نہ ہوتا، (۳)

عجمیوں کی عربی شاعری کی خصوصیات:

اسلامی عہد حکومت میں دوسری صدی ہجری کی ابتدا ہی سے عجمی اثرات روز افزوں ہونے لگے تھے، چنانچہ سیاسیات، تمدن اور ادبیات پر بھی ان کا گہرا اثر پڑنے لگا تھا، ہارون الرشید کے عہد خلافت میں برامکہ کی بدولت عربی کے ادب و شاعری میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو چلا تھا۔ عرب کے اسلوب پر لمبے لمبے قصائد لکھنا موتوف ہوگئے تھے، اور ان کا تتبع غیر ضروری خیال کیا جاتا تھا، اس طرح عربی شاعری میں ایک نئی تحریک وجود میں آرہی تھی، جس نے ساحل دجلہ پر جنم لیا، جہاں پر شوکت بارگاہ خلافت کی قدردانیوں اور حوصلہ افزائیوں نے ارباب شعر و ادب کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تھا،

---

(۱) کتاب الشعر والشعراء، ص ۸۲ مصر، (۲) مقدمہ ابن خلدون ص ۵۷۵،
(۳) العمدۃ جلد اول ص ۵۰،

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ابتدا میں اہل عجم شاعری میں عرب کا اتباع کرتے تھے، مگر ایک مدت کے بعد خود عربی شاعری پر عجمی اثرات پڑنے لگے، چنانچہ عجم کی شاعری نے آنکھیں کھولیں، تو عربی شاعری خود عجمی بن چکی تھی، صرف زبان کا فرق تھا، اس لیے ایران کی شاعری نے بظاہر عرب کی تقلید کی لیکن درحقیقت وہ اپنی ہی تقلید تھی، کیونکہ عربی شاعری کا تغیر عجم ہی کا اثر تھا، (۱)

عجمی اثرات کی وجہ سے عربی شاعری میں جو جو تغیرات رونما ہوئے اور اس پر 'ملکی و وطنی قومی و اجتماعی، ادبی و لسانی خصوصیات نے جو اثر ڈالا، اس کو تفصیل سے بتانا ذرا مشکل ہے، تاہم اجمالی طور پر اس عربی شاعری کی بعض خصوصیات کا یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے

فارسی زبان کے اثرات:

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انسان کے خیالات و جذبات اپنے اطراف اور ماحول سے متاثر ہوتے ہیں، ملکی اور وطنی خصوصیات میں زبان کا اثر سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ممالک اسلامیہ میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں عجمیوں کے ہاتھوں جو ادبی ذخیرہ جمع ہو رہا تھا اس کا اثر عربی ادب پر بالواسطہ ہونا لازمی تھا، چنانچہ امثال و محاورات ،بندش مضامین اور طرز ادا، اظہار خیال اور اسلوب بیان کے جو طریقے فارسی ادب میں رائج تھے، ان کو شعرائے عجم نے اپنی عربی شاعری میں بھی منتقل کرنا شروع کیا، حتیٰ کہ ان کی ترکیب شعری میں فارسی کا لسانی پہلو نظر آنے لگا، یا یوں کہو کہ عربیت کی بجائے عجمیت آگئی، اس کے ثبوت میں شعرائے عجم کے وہ عربی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں فارسی زبان کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں،

بعض اوقات عربی اشعار میں قصداً فارسی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن سے مقصد محض تفنن طبع ہوتا تھا، چنانچہ بصرہ والے اہل فارس کے بعض کلمات اپنے اشعار میں استعمال کیا کرتے تھے، جیسا کہ ابن رشیق نے لکھا ہے:

'بسا اوقات ایک شعر میں ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے

---

(۱) شعرالعجم جلد چہارم ص ۱۲۹،

ہیں جو دوسرے شہر میں مستعمل نہیں ہوتے، مثلاً اہل بصرہ کا اہل فارس کے بعض کلام کو اپنے اشعار اور نوادر حکایات میں استعمال کرنا'(۱)

(۲) قومی اور معاشرتی خصوصیات :

عجمیوں کی عربی شاعری میں ہم بدویانہ زندگی کی سادگی، بے تکلفی، اور فطری جذبات کی بجائے ایک طرح کی رنگینیٔ خیال، آورد اور تصنع پاتے ہیں، جن کو ایرانی زندگی کے پر تکلف عیش اور سامان حضارہ نے پیدا کردیا تھا، اہل عجم کے تمدن و معاشرت، قومی شعائر، خصائص ملی، اور عوائد و رسوم عرب سے مختلف اور جداگانہ تھے، اس لیے لازمی طور پر ان کی شاعری بھی انھی خیالات کے زیر اثر رہی، چنانچہ ان کے اکثر عربی اشعار میں ہم کو ان کی سیرت اور عوائد رسمیہ سے متعلق کئی الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ان کو عربوں سے ممتاز کرتے ہیں، مثلاً ان کی رسومات، آداب معاشرت، قومی تہوار، ملکی لباس وغیرہ کی نسبت متعدد اشارات پائے جاتے ہیں۔

(۳) فارسی کے اوزان وبحور کا استعمال :

اگرچہ زمانۂ اسلام میں ایرانیوں نے شعر گوئی میں عربی عروض کی تقلید کی، تاہم اپنے قدیم اوزان وبحور کو بھی یک لخت ترک نہیں کردیا تھا، البتہ عربی اوزان کو مطبوع طبع نہ پاکر انھوں نے عربی اوزان میں تصرفات کیے، مثلاً بحر ہزج اور بحر رمل کو جو عربی میں دراصل مسدس ہیں مثمن کرلیا یا مسدس میں بعض زحافات بڑھادیے، جس سے سامعین کو استکراہ نہ ہو، اور اشعار کے وزن میں بھی ثقل نہ رہے، اسی طرح ہزج اور رمل کی بحور مسدس سالم میں اگرچہ انھوں نے شعر نہیں کہا، لیکن ان دونوں بحروں کے مزاحفات فارسی کے مشہور ترین اوزان ہیں، مثلاً نظامی کی شیرین و خسرو اور لیلیٰ مجنوں، مولانا روم کی مثنوی،

فارسی کے قدیم ترین اوزان میں سے دو بیت یا رباعی ہے، اس وزن

---

(۱) العمدۃ ج ص ۱۵۸،

میں ان کے ہاں گیت گایا جاتا تھا، جس کو ''ترانہ'' کہتے تھے (۱) عہد اسلام میں فارسی کا جو قدیم ترین شعر بتایا جاتا ہے، وہ اسی وزن میں ہے(۲) رباعی کا یہ وزن دراصل ہزج کی انواع اخرب اور اخرم میں سے ہے اور عجمیوں نے اس بحرمیں عربی اشعار لکھے ہیں ۔(۳) ان سے پہلے عرب اس وزن پر شعر نہ کہتے تھے، المیزان الوافی میں لکھا ہے :

متقدمین عرب کے ہاں سوائے قطعات اور قصائد کے کچھ نہ تھا، متاخرین نے اشعار کی تمام انواع عجم سے لیں، جیسے رباعی جو دو بیت کے نام سے، اور مزدوجہ جو مثنوی کے نام سے مشہور ہیں'(۴)

رباعی کے وزن پر بعض اشعار پانچویں صدی ہجری میں ملتے ہیں، چنانچہ ایک عجمی شاعر احمد بن الحسین الخطیب نے جو عربی اور فارسی کا شاعر تھا، حسب ذیل رباعیاں لکھی ہیں :

قد حاض فراقه فقاری واللہ واستهلك هجره قراری واللہ
اذری الدم لیلی ونهاری واللہ لم یغن عن الهوی حذاری واللہ

ابلیٰ جسدی هوی ظلوم جانی قد هجن قده قضیب البانی
یامن اضحیٰ و ماله من ثانی ما ضرك لو فلكت هذا العانی

باخرزی نے یہ رباعیات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں اس طریقے سے بالکل گوش آشنا نہ تھا، لیکن میرے والد نے اس طرز پر مجھے ابوالعباس باخرزی کی یہ رباعی سنائی :

قد صیرنی الهوی اسیر الذله واستهلکنی وما بجسمی علہ
و استاصل هجره بصبری کله لاحول ولا قوة الا باللہ

---

(۱) المعجم فی معاییر اشعار عجم، مطبوعہ یورپ ص ۹۰، (۲) عوفی شمس قیس اور دولت شاہ نے قدیم شعر کی مثال میں ایک مصرعہ نقل کیا ہے، جو حسب ذیل روایات پر مبنی ہے۔ ایک لڑکا اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا، بچے کے منہ سے بیساختہ نکل گیا 'غلتان غلتان ہمی رود تالب گور۔ ایک شاعر نے جو وہاں کھڑا ہوا تھا، کلام موزوں سمجھ کر اس پر تین مصرعے اور لگادیے، اور دو بیتی نام رکھا، کچھ دنوں کے بعد اس کو رباعی کہنے لگے'۔ شمس قیس کا بیان ہے کہ یہ شاعر رودکی تھا، ص ۸۹، ۸۸، (۳) المعجم ص ۹۰، (۴) ہفت آسمان ص ۴۔

اس کے بعد باخرزی نے اپنے والد کی دو رباعیاں نقل کی ہیں،(۱) شمس الدین محمد بن قیس رازی (صاحب المعجم) کے زمانے میں ساتویں صدی کے نصف اول میں اس وزن پر عربی رباعیات تمام بلاد عرب میں شائع اور متداول ہوچکی تھیں (۲)

رباعی کے علاوہ عجمیوں کی ایک اور ایجاد ہے جس کا نام انھوں نے مثنوی رکھا ہے، جس میں ہر شعر میں علاحدہ دو دو قافیے ہوتے ہیں، عربی میں بھی اس نہج پر شعر کہے گئے ہیں، اور اس کا نام مزدوج رکھا گیا ہے، بعد میں عربی شعراء نے بھی مثنوی کے طرز پر اشعار لکھے ہیں، چنانچہ ابن المعتزہ کا قصیدہ مزدوجہ مشہور ہے، آزاد بلگرامی نے مثنوی کے نمونے کے طور پر شیخ بہاء الدین عاملی کے بعض اشعار نقل کیے ہیں (۳)

عربی میں ذوالقافیتین اشعار کی ایجاد بھی عجمیوں نے کی ہے، چنانچہ رشید و طواط نے حدائق السحر میں مسعود سعد سلمان کے یہ اشعار بثال میں پیش کیے ہیں۔

ما ليلة اظلمت علينا ليلاء قارية الدجنه
قد راكضت فی الدجی علینا دهما خدارية الا عنه
فبت اقتاسها فكانت حسبىل نهارية الاجنه (۴)

اشعار بالا کا یہ وزن مفعول مفاعلن فعولن 'فارسی والوں کا ہے، لیکن بعض عربی شعرا نے بھی اس کو استعمال کیا ہے، چنانچہ بہا زہیر مصری کے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں:

یامن لعبت بہ شمول ما الطف هذه الشمائل
فتںوان یهزه دلال كالغصن مع النسیم مائل(۵) الخ

اگرچہ یہ بحر عربی عروض کی بحروں میں داخل نہیں ہے، مگر سعدی نے اس کو بحر واخر کی ایک قسم بتایا ہے(۶)

ملمعات

فن بدیع کی ایک قسم تلمیع ہے، جو عجمی اثرات کا نتجہ ہے،

---

(۱) دمیته القصر و عصرة اہل العصر ص ۱۷۴، طبع حلب (۲) المعجم ص ۹۰، (۳) سجۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص ۱۳۲ طبع بمبئی۔
(۴) سجته المرجان فی آثار ہندوستان ص ۲۸، (۵) ایضاً، ص ۱۳۳، ۱۳۴،
(۶) شرح لامیۃالعجم للصفدی ج ۱ ص ۳۲،

رشیدوطواط نے حدائق‌السحر میں اس کا ذکر کیا ہے، چنانچہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :

> 'تلمیع لغۃ میں گھوڑے کے جسم پر ان دھبوں یا داغوں کو کہتے ہیں جو اس کے رنگ سے مخالف ہوں، اور اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جو عربی اور فارسی یا کسی دوسری زبان سے مرکب ہو اس طرح کہ ایک ایک مصرعہ عربی میں ہو اور ایک ایک مصرعہ فارسی میں، یا ایک بیت عربی میں اور ایک بیت فارسی میں، یا ایک بیت سے زائد ہو، و طواط نے حدائق‌السحر میں اس کا ذکر کیا ہے(۱)'

اس صنعت کا رواج کب سے ہوا، یہ بتانا دشوار ہے، تاہم چوتھی صدی ہجری کے بعد سے عجمیوں نے فارسی آمیز عربی یا عربی آمیز فارسی شعر لکھنا شروع کردیا تھا، چنانچہ اس قسم کے اشعار جن میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک مصرعہ عربی ہوتا ہے، یا فارسی اشعار کے ساتھ خالص عربی اشعار ہوتے ہیں، متعدد شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں، خصوصاً مشاہیر شعرائے فارسی میں، انوری، سعدی، خسرو، حافظ، عماد، اور جامی کے ہاں ملمعات پائے جاتے ہیں، بلکہ سعدی کے کلیات میں تو ایک خاص مجموعۂ اشعار ''ملمعات'' کے نام سے شامل ہے(۲)

فارسی شعرا کا عربی کلام

فارسی شعراء میں ایک خاصی تعداد ایسے شعراء کی ملے گی جنھوں نے عربی زبان میں بھی اشعار موزوں کیے ہیں، ان میں ایسے شعرا بھی تھے، جو دونوں زبانوں میں شعر کہنے کی قدرت رکھتے تھے، چنانچہ ایسے عجمی شعرا، کا جنھوں نے عربی میں شعر کہے ہیں، ثعالبی نے یتیمۃ الدھر میں، اور باخزری نے دمیۃ القصر میں ذکر کیا ہے، اور ان کے عربی کلام کے نمونے بھی نقل کیے ہیں، ایسے شعراء کو وہ ذواللسانین کہتے ہیں، ان کے علاوہ اور مشاہیر شعرائے فارسی کے عربی اشعار ان کے دواوین اور کلیات میں پائے جاتے ہیں، فارسی کے مشاہیر شعراء میں عربی گو شعراء بہت کم ہیں، ہم یہاں ان کے عربی کلام کا ذکر کرتے ہیں :

---

(۱) سبحۃ‌المرجان‌فی آثار ھندوستان ص ۲۰۲

(۲) کلیات سعدی (نولکشور) قصائد فارسیہ ص ۵۷ تا ۶۳

(۱) فارسی شعراء میں صرف مسعود سعد سلمان ایک ایسا شاعر تھا، جس نے فارسی اور ہندی کے علاوہ عربی میں بھی اپنا دیوان مرتب کیا تھا، (۱) دولت شاہ بھی اس کی نسبت لکھتا ہے کہ '' اشعار عربی بسیار دارد'' (۲) وہ خود بھی دعویٰ کرتا ہے،

زبان دولت عالی بہ بندہ داد پیام
کہ اے ترا دو زبان پارسی وتازی دام

منم کاندر عرب و اندرعجم کس نباشد چون من از چیرہ زبانی
سجود آرد بہ پیش خاطر من روان رودکی و ابن ہانی(۳)

حدائق‌السحر میں رشید و طواط نے بدایع کی مثالوں میں اس کے عربی اشعار نقل کیے ہیں جن کو آزاد نے حدائق سے لیا ہے(۴)

ثق بالحسام فعہدہ میمون وارکب و قل للنصر کن فیکون

تلوار کو مضبوط پکڑ کہ اس کا عہد مبارک ہے
گھوڑے پر سوار ہو اور فتح سے کہہ دے کہ ہو جا تو وہ ہو جائے گی،

قطعۂ ذیل توریہ کی مثال میں پیش کیا گیا ہے:

ولیل کان‌الشمس ضلت مترحا ولیس لھا نحو المشارق مرجع

اور وہ ایسی رات تھی کہ جس میں آفتاب اپنی گذرگاہ بدل گیا، گویا مشرق کی طرف اس کا مرجع ہی نہ تھا یعنی اس رات کی صبح ہی نہ تھی،

نظرت الیہ والظلام کانہ علی العین غربان من الجووقع

میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایسی تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ گویا کوے فضا سے چشمے پر اتر آئے ہیں

فقلت لقلبی طال لیلی و لیس لی من الھم منجاہ وفی الصبر مفرزع

تو میں نے اپنے دل سے کہا کہ میری رات دراز ہوگئی اور میرے غم کا کوئی چھٹکارا نہیں ہے کہ صبر ہی میں نجات ہے،

اری ذنب السرحان (۵)فی الجوطالعا فھل ممکن ان الغزالۃ تطلع (۶)

میں دیکھتا ہوں 'دم گرگ فضا میں طلوع ہوگیا ہے، توکیا یہ ممکن ہے

(۱) لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص ۲۴۶، گب (۲) تذکرہ (طبع بمبئی) ص ۹ (۳) سوانح مسعود سعد سلمان مرتبۂ عبدالوہاب قزوینی و مترجمۂ براؤن ص ۹ (۴) سجتہ المرجان ص ۲۷، ۲۸ (۵) دم گرگ سے مراد صبح کاذب ہے، (۶) عرب لوگ آفتاب کو غزالہ بھی کہتے تھے، مگر غزال کی تانیث غزالہ نہیں آتی بلکہ اس کی بجائے ظبیہ بولتے ہیں، (دیکھو شرح لامیہ للصفدی ج ۲ ص ۱۴۳،

کہ اب ہرن نکلے (آفتاب طلوع ہو)

(۲) مسعود کے بعد صرف شیخ سعدی ہی ایسے شاعر ہیں، جن کے عربی کلام کا مجموعہ ان کے کلیات میں شامل ہے، سعدی کے عربی قصائد خصوصاً زوال بغداد پر ان کا مرثیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، ان کے عربی قصائد کی تعداد ۲۰ ہے، گلستان میں بھی جیسا کہ انھوں نے خاتمے میں تصریح کی ہے تمام عربی اشعار انہی کے ہیں، ان کے عربی کلام میں جو سلاست، سادگی، بے تکلفی، اور آمد پائی جاتی ہے، وہ ان کے کلام کو دوسرے فارسی شعراء سے ممتاز کرتی ہے، ابن معصوم نے سعدی کے دس اشعار نقل کیے ہیں(۱) جو ایک خاص انداز ترنم میں لکھے گئے ہیں :

یا ندیمی قم بلیل واسقنی و اسق الندامی
اے ہم نشین رات کو اٹھ اور مجھے اور میرے رفیقوں کو شراب پلا

خلنی اسھر لیلی ودع الناس نیاما
مجھے رات بھر جاگنے دے اور لوگوں کو سوتا ہوا چھوڑ دے

اسقیانی و مدین الرعد قد ابکی الغماما
مجھے شراب پلادے اس حالت میں کہ رعد نے برسات کو رلا دیا ہے

فی اوان کشف الور دعن الرجہ اللثاما
ایسے وقت میں کہ گلاب نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے

ایھا المصغی الی الز ھاد دع عنك الکلاما
اے زاہدوں کی باتیں سننے والے اپنی باتوں کو موقوف کردے

قزبھا من قبل ان یجعلك الدھر عظاما
اور شراب پلا۔۔۔۔۔۔قبل اس کے کہ زمانہ تجھے استخوان میں تبدیل کردے

لا عرفت الحب ھیھا تولا ذقت الغراما
افسوس ہے کہ تو نے محبت کو پہچانا ہی نہیں، اور نہ لذت عشق کو چکھا،

قل لمن عیر اھل الحب فی الحب و لاما
کہہ دے اس شخص سے، جس نے عشاق کو ان کی محبت پر شرم دلائی اور ملامت کی،

لا تلمنی فی غلام اودع القلب سقاما
مجھے اس غلام کے لیے ملامت نہ کر جس نے میرے دل کو بیمار کر رکھا ہے

فبذاك الحب کم من سید اضحی غلاما
اسی محبت کے طفیل میں کئی آقا غلام بن گئے۔

---

(۱) سلافتہ العصر ص ۴۹۱،

(۳) اسی طرح فارسی کے ناموور شاعر اور فلسفی حکیم عمر خیام نے بھی اپنی فارسی رباعیات کے علاوہ عربی اشعار کہے ہیں، اس کے چند اشعار جن میں معری کی جھلک پائی جاتی ہے، قفطی نے نقل کیے ہیں، (۱)

اذ ارضیت نفسی مجبور بلغة یحصلها بالله کفی و ساعدی

جب کہ میرا نفس تھوڑی سی معاش پر راضی ہو جائے، کہ جسے میرے دست و بازو نے حاصل کیا ہو،

أمنت تصاریف الحوادث کلها فکن یازمانی موعدی اوساعدی

(اور) میں تمام حوادث سے مامون ہوں، تو اے زمانے! تو خواہ دھمکانے والا یا مساعد اورسازگار بن جا،

الیس قضی الافلاک فی دودھابان تعید الی نحس جمیع المساعد

کیا گردش افلاک نے ایسا نہیں کردیا، کہ تمام نیک شگونیاں بد شگونیاں بن جائیں،

فیا نفس صبراً فی مقیلك انما تخر ذراه بانقاض القواعد

پس اے نفس تو اپنی آرامگاہ میں صبر کر، کہ بنیادوں کے اکھڑتے ہی اس کی بلندیاں بھی گر پڑیں گی،

اس قطعے کے بقیہ اشعار مع دیگر چند شعروں کے شہرزوری نے اپنی تاریخ الحکما میں نقل کیے ہیں(۲)

(۴) خواجہ امیر خسرو (رحمة الله علیه) نے چند عربی اشعار غرة الکمال کے دیباچے میں لکھے ہیں، جن سے زبان پر ان کی قدرت ظاہر ہوتی ہے:

ذاب الفواد وسال من عینی الدم وحکی الدوامع کل ما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھوں سے خون بہہ گیا، اور آنسوؤں نے وہ سب کہہ دیا جسے میں چھپاتا تھا،

واذا بحت لدی الوری کرب النوی تبکی الاحبة والاعـادی ترحم

جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں، تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو (میرے حال پر) رحم آتا ہے،

یا عاذل العشاق دعنی باکیا ان السکون علی المحب محرم

او عاشقوں کے ملامت گر تو مجھے رونے دے، کہ چپ رہنا عاشق پر

---

(۱) تاریخ الحکماء طبع یورپ ص ۲۴۴،

(۲) دیکھو شعر العجم ج ۱ ص ۳۳۴، ۳۳۵

حرام ہے،

من بات مثلی فھویدری حـالتی — طول اللیالی کیف بات متمم

جو شخص میری طرح رات گذار دے وہ البتہ جان سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح کٹتی ہے(۱)

(۵) خواجہ حافظ شیرازی نے متعدد عربی اشعار لکھے ہیں جو ان کے موجودہ دیوان میں پائے جاتے ہیں، ہم نے خواجہ کے عربی کلام پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جو رسالہ تسنیم (آگرہ) بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوچکا ہے،

(۶) مولانا جامی، جن کی نسبت کہا گیا ہے کہ ۔ زجامی سخن را تمامی رسید ۔ عربی کے جید عالم اور نامور مصنف تھے، اور عربی ادب پر بھی کافی عبور رکھتے تھے، ان کے فارسی کلام میں بعض عربی اشعار بھی پائے جاتے ہیں :

ان کے کلیات میں متعدد اشعار صنعت تلمیع میں پائے جاتے ہیں جن میں فارسی کے ساتھ عربی مصرعوں کا پیوند لگایا گیا ہے، لیکن خالص عربی اشعار شاذ و نادر نظر آتے ہیں، آذر اصفہانی(۲) نے ذیل کی دو شعر نقل کیے ہیں :۔

سلام اللہ ماناحت‌حمامہ — لفقد الألف او حادت خمامہ

علیٰ اکناف واد حل فیھا — سعاد بالسعادۃ والسلامہ

عربی شاعری پر عجمی اثرات کا نتیجہ

اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ اہل عجم نے عربی شاعری میں فطری سادگی اور بے ساختگی کے بجائے تصنع اور تکلف پیدا کردیا، اور اس لیے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عربی شاعری میں پرشکوہ اور شاندار الفاظ، بلند آہنگی، صنائع و بدائع کا استعمال، جن کا بہترین نمونہ متنبی کا کلام ہے، اور جو مابعد کے اسلامی شعراء کا مخصوص وصف ہے،سب سے

---

(۱) شعرالعجم ج ۲ ص ۱۹۱،

(۲) آتشکدہ ص ۸۰ طبع بمبئی

پہلے ان عجمیوں نے داخل کیا جو بغداد میں دربار خلافت کے متوسل تھے، لیکن عربی شاعری کا یہ طرز و اسلوب عجمی الاصل نہیں ہے، کیونکہ بعض عجمی النسل قدیم شعرائے عربی بشار بن برو اور ابو نواس کے کلام میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا، دراصل ایرانیوں نے عربی شاعری کو جن باتوں سے روشناس کرایا، وہ پرشکوہ طرز نہیں ہے، بلکہ وہ سلاست و روانی، حسن تخیئل، صفائی بیان، عمق جذبات اور نفاست خیال ہیں، (۱)

---

(۳) تاریخ ادب العرب از نکلسن ۲۹۰

سندھ کا فارسی ادب

ہندوستان کے اسلامی عہد میں غزنویوں سے لے کر مغلوں کے زمانے تک فارسی ہندوستان کی علمی اور ادبی زبان بنی رہی ۔ اور درۂ خیبر سے آنے والے آن ترک اور تاتاری فاتحین کی سرپرستی نے فارسی زبان و ادب کو پروان چڑھایا اور انہی کی زیر سرپرستی فارسی کا ادب نشوونما پاتا رہا۔اس وقت سے تقریباً آٹھ سو برس تک اسلامی ہند کا تاریخی، مذہبی اور صوفیانہ ادب تمام تر فارسی زبان میں لکھا گیا ۔ مورخین نے فارسی ادب کی تاریخ کو عہد تیموری تک لا کر چھوڑ دیا ہے اور اس سے آگے ہند کے فارسی ادب کی طرف کم توجہ کی گئی ہے، بلکہ ایک حد تک اس کو نظر انداز کیا گیا ہے ۔ لیکن فارسی ادیب اور شاعر وقتاً فوقتاً ایران سے ہندوستان آتے رہے ہیں ۔ اور سولھویں اور سترھویں صدی میں ایرانی شعرا بہت بڑی تعداد میں ہندوستان آنے لگے جہاں شہنشاہ اکبر اور اس کے جانشین فرمانرواؤں کی قدر دانی اور دادودہش کی شہرت نے ان کو اپنے درباروں میں کھینچ بلایا تھا ۔ اس کی بدولت ہندوستان فارسی ادب کا ایک دوسرا مرکز بن گیا جہاں ایک خاص قسم کی ہندوستانی فارسی طرز نے نشوونما پائی جس نے وسط ایشیا کے ادب پر زبردست اثر ڈالا ۔

فارسی ادب کی تاریخوں میں صرف متقدمین کے تذکرے ملتے ہیں اور متاخرین میں سے صرف ان مشاہیر کو لیا گیا ہے جو ملک فارس کے کسی نہ کسی شہر میں پیدا ہوئے ۔ ہندو پاکستان کے فارسی ادیبوں اور شاعروں میں سے صرف مشہور ترین مصنفوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن آخری دور کے ہندی اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے متعلق فارسی تذکروں میں صرف ناموں اور چند اشعار کے نمونوں کے سوا کچھ بھی دستیاب نہیں ہوتا ۔

مسلمانوں کی فتح سندھ و ہند کے بعد سے یہاں کے مسلمانوں کی عام زبان فارسی رہی ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے علوم کی بھی تحصیل کی جاتی تھی اور اس زبان میں تصنیف و تالیف بھی ہوتی رہی ہے لیکن عموماً تاریخ و تصوف اور شعر و ادب کے لیے فارسی زبان ہی اظہار خیال کا ذریعہ تھی۔

ہند و پاکستان کی علمی و ادبی تاریخ پر بہت کم کام ہوا ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ خصوصاً گجرات اور سندھ ایسے دو وسیع صوبے ہیں کہ جہاں اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم نے سب سے پہلے رواج پایا اور وہاں صدیوں تک ان کی نشوونما ہوئی لیکن ان کے متعلق اب تک بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں۔ ان دو خطوں میں ہزار ہا عالم، ادیب، شاعر اور اہل فن گزرے ہیں جن کی بے شمار تصانیف اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔

تاریخ ہند و پاکستان میں سندھ کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس برصغیر کا یہی وہ حصہ ہے، جہاں سب سے پہلے اسلامی لشکر نے توحید کا پرچم لہرایا اور فتح کا ڈنکا بجایا۔ اسی سرزمین میں فرزندان اسلام نے بارہ سو سال تک حکومت کی ہے۔ عربوں نے تقریباً چار سو سال تک اس پر حکمرانی کی۔ ان کے بعد یہاں کے مقامی فرمانروا سومرہ اور سمہ قوم کے خاندان تقریباً چار سو سال برسر اقتدار رہے۔ اسی اثناء میں مسلمان سلاطین ہند میں سے غزنویوں، ایبکوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں اور مغلوں نے بھی وقتاً فوقتاً اپنے اپنے عہد میں اس پر اپنا اقتدار جمانے کی کوششیں کیں، ان کے بعد چنگیزی، تاتاریوں میں سے ارغون اور ترخان کے خاندانوں نے اپنا قبضہ جمایا اور تقریباً دو سو سال تک اس ملک پر فرمانروائی کی۔ پھر عباسیوں کی ایک شاخ کلھوڑوں نے کوئی سو برس تک اس کو اپنا مرکز حکومت بنائے رکھا اور آخر میں تالپور میروں نے تقریباً ایک صدی تک یہاں حکومت کی۔ ان حالات میں ملک سندھ اسلامی تمدن اور ثقافت کا سب سے پہلا مرکز رہا ہے۔ عربوں کی بدولت یہاں عربی علوم و فنون کے سر چشمے جاری ہوئے اور ترکوں اور مغلوں کی سرپرستی سے یہاں فارسی ادب اور شعر و سخن کی گرم بازاری رہی۔

فارسی ادب نے سندھ میں اپنا کس قدر حصہ پیش کیا ہے۔ اس کو بیان کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے، کہ فارسی زبان سندھ میں کب آئی۔ مورخ بلاذری کا بیان ہے کہ محمد بن قاسم جب سندھ پر فوج کشی کے لیے آ رہا تھا تو اس کی فوجیں شیراز میں جمع ہو کر سندھ کی طرف روانہ

ہوئیں ۔ ان میں بہت سے شیرازی بھی ہوں گے جن کی مادری زبان فارسی تھی اس لیے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ فارسی زبان یہاں ایرانیوں کی بدولت پہنچی ہوگی جو محمد بن قاسم کی فوج میں شریک تھے ۔ دوسری صدی ہجری میں یعقوب بن لیث صفار کو جب سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا تو اس کے قیام سندھ کے زمانے میں فارسی زبان کی اشاعت ہوئی ہوگی کیونکہ یعقوب عربی سے بالکل نا واقف اور فارسی دانوں کا بڑا سرپرست تھا ۔ عموماً ملک کے انتظام میں حاکم وقت کی زبان استعمال کی جاتی ہے اور بہت ممکن ہے اس زمانے میں فارسی زبان سرکاری دفاتر میں استعمال کی گئی ہو اور بعض اہل سندھ نے بھی اس کی تحصیل کی طرف توجہ کی ہو ۔ لیکن تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح ابن موقل اور سعودی جو سندھ آئے تھے ان کا بیان ہے کہ یہاں صرف سندھی اور عربی زبانیں رائج ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک سندھ میں عربی زبان کا سکہ رواں تھا اور کسی غیر زبان نے اس کی جگہ نہیں لی تھی ۔ اس کے بعد پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں سندھ دولت غزنویہ کا باجگذار تھا اور دونوں ملکوں کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے تھے ۔ ان کے اثرات سے سندھ میں فارسی زبان کا رواج پانا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے ۔ چنانچہ اسی زمانے میں بشاری مقدسی نامی عرب سیاح جو سندھ آیا تھا لکھتا ہے کہ اس زمانے میں ویلمیوں کے نام کا خطبہ سندھ اور سلتان کی مسجدوں میں فارسی میں پڑھا جاتا ہے ۔

سندھ میں فارسی زبان کی سب سے پہلی تصنیف جو ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ علی بن حامد ابوبکر کوفی کی کتاب 'چچ نامہ' ہے جو قاضی اسماعیل بن علی الثقفی کے خاندان کی عربی کتاب منہاج المسالک کا فارسی ترجمہ ہے اور ۶۱۳ھ میں لکھا گیا ہے ۔ اصل عربی کتاب اس وقت مفقود ہے ۔ یہ سندھ کی پہلی تاریخ ہے جو فتح سندھ کے حالات پر مشتمل ہے اور شائع ہو چکی ہے ۔ اس کتاب کے متن میں مترجم نے اپنے بعض اشعار نقل کیے ہیں جن سے فارسی شعر گوئی پر اس کی قدرت کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ اشعار ناصر الدین قباچہ کی مدح میں لکھے گئے ہیں :

خسروا ملک با تو خرم باد — کل گیتی ترا مسلم باد
از تو آباد ظلم ویران شد — با تو بنیاد عمل محکم باد
خطبه تعظیم یافت از نامت — هم چنیں سال ومه معظم باد
وانچه در ملك جم نه بود ترا — همه زیر نگیں مختم باد
چتر میمون و همت عالیت — سایه دار سپهر اعظم باد

هر دلی کز تو سال عصیان نیست همه کاوش چو زلف برهم باد
تاکم و بیش در شمار آید دوستت بیش و دشمنت کم باد
یمینیت . چو . سلك . دادیسار
دریسار تو خاتم. جم باد

اسی زمانے میں سندھ میں ایک اور شاعر ملتے ہیں جو خراسان کے شہر مروند سے یہاں تشریف لائے اور لعل شہباز کے نام سے بشہور ہیں جنھوں نے ۱۲۰ سال کی عمر میں ۶۵۰ھ میں وفات پائی ان کی بعض غزلیں سندھ کے پرانے قلمی نسخوں اور مقالات الشعراء وغیرہ میں پائی جاتی ہیں چند اشعار یہ ہیں :

ایا عثمان مروندی سخن .با پردہ داری گو
نیابی در جہاں یاری جہانی پرز اغیار است
ز عشق دوست ہر ساعت درون ناری رقصم
گہے بر خاك می غلطم گہی بر خار می رقصم
شہباز لا مکانم من در مکاں نہ گنجم
عنقاے بے نشانم من در نشاں نہ گنجم

انگریز مورخ برٹن کا بیان ہے کہ عقد قسم دویم، اجناس اور میزان و نہی شیخ عثمان کی تصنیف سے ہیں جو کسی زمانے میں درسی کتابوں کے طور پر اسکولوں میں پڑہائی جاتی تھیں -

سموں کے عہد حکومت میں بعض فارسی کے شعرا گزرے ہیں، ان میں نظام الدین عرف جام ننده اسی خاندان کا ایک فرمانروا تھا جو فارسی کا اچھا شاعر تھا - وہ اپنے متعلق ایک رباعی میں لکھتا ہے :

ای آنکه ترا نظام دین می خوانند
تو مفتخری مرا چنین می خوانند
گر در رہ دین ز تو خطائے رفته
شك نیست که کافر لعین می خوانند

اسی عہد کے ایک اور شاعر مخدوم بلال تھے جو ٹلھٹی کے رہنے والے اور علوم شرعیہ میں بھی دستگاہ رکھتے-تھے ان کی ایک رباعی مشہور ہے :

در راہ خدا ز سر قدم باید ساخت
سرمایۂ اختیار خود باید ساخت
کفر است بخود نمائی بودن بجہاں
از خویش برون وسویش می باید تاخت

آٹھویں اور نویں صدی میں سندھ میں ارغون اور ترخان قبیلے کے ترک برسر حکومت تھے جو نسل چنگیزی سے تھے۔ان فرمانرواؤں میں مرزا شاہ حسن بن شاہ بیگ ارغون بڑا عالم و فاضل شخص تھا، اور علوم معقول میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ شعر و سخن میں بھی دسترس تھی اور سپاہی تخلص کرتا تھا، ۹۶۲ھ میں وفات پائی۔اس کی ایک غزل صاحب مقالات الشعراء نے نقل کی ہے۔ اس کے بعض شعر یہ ہیں :

عشقت که بود مایهٔ ارباب سلامت
از وے نه شود حاصل ما حزبه ندامت
عمریست که ای سرو خرامنده گذشتی
غائب نشد از دیدهٔ من آن قد و قامت
پا بوس سگت گر به سپاهی ندهد دست
تا زنده بود میگزد انگشت ندامت

اس فرمانروا کے عہد میں کئی عالم فاضل ادیب اور شاعر گذرے ہیں جن میں سے کوئی اٹھارہ بزرگوں کا ذکر صاحب تاریخ معصومی نے کیا ہے۔ انہی میں مولانا فخری ہروی بھی تھے جو عالم و فاضل اور فارسی کے اچھے شاعر تھے، اور صنائع و بدائع اور عروض و قافیہ میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ اسی عہد کا مشہور شاعر حیدر کلوچ تھا جو صاحب دیوان تھا اس کا یہ مطلع معصومی میں منقول ہے :

دلا مجنون صفت خود را خلاص از قید عالم کن
ره صحرائے محنت گیرورو در وادئ غم کن

اسی شاہ حسن ارغون کے ابتدائی زمانۂ حکومت میں شاہ جہانگیر ہاشمی سندھ آئے، اس کے دربار میں اعزاز و اکرام پایا اور بھکر میں رہ پڑے۔جامی کی تحفة الابرار کے جواب میں ان کی مثنوی مظہر الآثار اور مخزن الاسرار کے جواب میں مظہر الانوار مشہور ہیں ۹۴۶ھ میں سفر حج کے اثناء میں شہادت پائی۔

مرزا جانی بیگ ترخان کے عہد میں سید محمد ہاشم سندھ کے ایک بڑے نامور شاعر اور مصنف گذرے ہیں۔ انہوں نے سیرالسلاطین نامی کتاب نظم میں لکھی اور اس کو مرزا جانی بیگ کے نام سے منسوب کیا ہے۔ مرزا مذکور کی مدح میں انہوں نے قصائد غرا لکھے ہیں۔ ایک قصیدے کا مطلع ہے:

ای بردر رفیعت کیواں کمینه دربان
وی حارس حریمت باشد سپهر گردان

اسی عہد میں میر غروری کاشانی سندھ میں آ کر آباد ہوئے تھے اور ٹھٹھہ میں رہتے تھے - صاحب دیوان تھے ان کے دو شعر ہیں :

چو افروز و رخ ازمی برنخیزد از گرانباری
ز بس در دامنش بال و پر پروانہ می ریزد
از بخت چساں شکوہ تواں کرد غروری
بیطالعی اہل ہنر رسم قدیم است

رضا بن عبدالواسع داروغہ گھر یا داروغۂ گھر ساکن تتہ ایک بڑے فاضل اور صوفی بزرگ تھے جنھوں نے سندھ کے مشہور بزرگ حضرت سید عبدالکریم بلٹھری کے ملفوظات میں رسالہ بیان العارفین و تنبیہہ الغافلین لکھا ہے - شعر بھی کہتے تھے - ۱۰۳۸ھ میں وفات پائی - ان کا شعر ہے :

بغم تو ہر کہ جاں داد چہ غمش زروز محشر
کہ ز زہرے نہ ترسد خوردآں کہ بیش افیون

سلاطین ترخانیہ کے دور کا ایک امیر کبیر خسرو خان تھا جس نے لاکھوں روپے صرف کر کے سندھ میں تین سو ساٹھ مسجدیں تعمیر کرائیں - وہ فارسی کا شاعر بھی تھا - چنانچہ اس کے تین شعر مقالات الشعراء میں درج ہیں - اپنے نفس سے خطاب کر کے کہتا ہے :

خسروا خانۂ تو در وقتی کہ از جان کرم
ہر صباح و شام می خوانی بسی اہل ہمم
خانئی درگہ رب‌العالمین باشی اگر
از تو ناراضی رود جائے ز تن سوئے عدم
جہد کن گرد آردلہائے خلائق وانگہے
ہر چہ باشی باش یکسانست گیرائے محتشم

اسی خسرو خان کے ایک معاصر عبدالقادر ولد سید محمد ہاشم حسینی تھے جنھوں نے امیر کی مدح میں یہ اشعار لکھے ہیں :

جمال صورت و معنی کمال دین و دول
نہال دولت و جاہ و گل حدیقۂ جان
خلیل خلق و مسیحا نفس علی ہمت
جلیل قدر رفیع‌المکان عظیم الشان
زہے کریم کہ دست سخائش غارت کرد
ہمہ ذخائر بحر و ہمہ دفائن کان

سحاب دست نوائش چو قطرہ بار شود
ز قطرہ قطرہ شود رشحہ قلزم عمان

اسی زمانے میں ترخانی قبیلے کی ایک عورت جس کا تخلص عصمت تھا بڑی اچھی شاعرہ تھی اور فن شعر میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی، چنانچہ ایک واہی شاعر کی ہجو میں کہتی ہے:

بہجر شعر نبود ہمچو واہی کسی در عہد ما گشتی تباہی
نیست در عالم بجز از درد عشق گوئیا نبود بدنیا مرد عشق

ارغون(۱) دور کے ایک شاعر شیخ عبداللہ آہی، ہرات کے رہنے والے تھے جو شاہ بیگ ولد امیر ذوالنون ارغون کے ہمراہ سندھ آئے تھے۔ ۹۵۰ھ میں وفات پائی۔ سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے اور اچھے شاعر تھے۔ آہی تخلص کرتے تھے، ان کا ایک شعر ہے:

پس از مند کس مپرسد حال آہی
شہید عشق گمنام دوام است

اسی دور کے ایک صاحب اقتدار امیر ابوالقاسم سلطان بیگ لار تھے جو بڑے دقیقہ سنج تھے اور شعر فہمی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور بیگلر تخلص تھا۔ قبیلہ ارغون کا شاعر اوراگی بیگ لاری انہی کے عہد کا شاعر ہے جس نے ایک عشقیہ مثنوی چنیسر نامہ لکھ کر ان کے نام سے معنون کی ہے۔ یہ سندھ کے دو وارفتگان عشق چنیسر اور لیلا کے عشق کی داستان ہے۔امیرابوالقاسم کے بعض اشعار تاریخ بیگلر نامہ میں منقول ہیں جو ان کے حالات میں تصنیف ہوا ہے اور سندھ کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔

ارغون خاندان کے فرمانروا شاہ حسین ارغون حاکم ٹھٹھہ تھے۔ ان سے امراء برگشتہ ہو گئے اور انہوں نے مرزا عیسیٰ ترخان کو اپنا حاکم تسلیم کیا اور اس کے بعد سے ترخانیوں کا اقتدار اس علاقے میں قائم ہو گیا۔ اسی عیسیٰ ترخان کا پوتا مرزا جانی بیگ صاحب علم و فضل اور شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ شعرا کا قدر دان اور سرپرست تھا۔ اس کا بیٹا غازی بیگ ترخان بھی اپنے باپ کی طرح شعر و ادب کا متوالا تھا اور شعرا کی قدر دانی میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔کئی شعرائے فارسی اس کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ چنانچہ مشہور ایرانی شعراء ملا مرشد بردجردی، طالب آملی، میر نعمت اللہ ولی، ملا اسد اس کے دربار کے متوسلین میں تھے۔ مرزا غازی بیگ خود بھی اچھا شاعر تھا اور حلیمی اور فادری تخلص کرتا

تھا۔ تھوڑی مدت میں اس نے کوئی پانچ ہزار اشعار کہے ہیں۔اس نے ۱۰۱۸ھ میں وفات پائی۔

اسی خاندان کا ایک فرمانروا شاہ بیگ عادل ترخان بھائیوں کی دشمنی کی وجہ سے مرزا جانی بیگ کے عہد میں اکبر سے جا ملا اور جہانگیر کے عہد میں وہ قندہار کا حاکم مقرر کیا گیا وہ بڑا نکتہ سنج اور سخن شناس تھا اس کا ایک شعر ہے :

اہل صورت جلمہ زینت دوست آئد
بر لب تصویر خاموش ایں صدا کنست

میر طاہر محمد نے اپنی تاریخ طاہری اسی کے لیے تصنیف کی تھی۔ سید محمد طاہر خود فارسی کے اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ اور نسیانی تخلص کرتے تھے انھوں نے عمر اور ماروی کا قصہ مثنوی ناز و زیبا میں نظم کیا ہے جو سندھ کی مشہور عشقیہ داستان ہے۔ عہد مغلیہ میں فارسی شعر و ادب کو سندھ میں سب سے زیادہ ترقی نصیب ہوئی اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ اکبر سے لے کر شاہ عالم کے زمانے تک مغل منصب دار اور حکام یہاں آتے جاتے رہے اور بعض مغل سلاطین کا سندھ آنا بھی تاریخوں میں مذکور ہے۔ پھر یہ وہ زمانہ ہے کہ اکبر اور اس کے جا نشینوں اور ادب پروری کی کشش سے اکثر ایرانی شعراء ہندوستان جاتے ہوئے سندھ سے گذرتے اور یہاں قیام کرتے رہے اور یہاں کے لوگ ان سے استفادہ کرتے رہے چنانچہ مشہور شعرائے متاخرین میں سے ملا مرشد بردجردمی، نعمت اللہ ولی، طالب آملی صائب اصفہانی، علی حزیں کے علاوہ کئی شعراء ایران سے سندھ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے فارسی ادب سندھ میں پھلتا پھولتا رہا۔

اکبر کے دور سے لے کر محمد شاہ کے زمانے تک حکومت مغلیہ کے منصب دار اور حکام وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے۔اس عہد میں سندھ کے ایک مشہور ادیب اور مورخ میر معصوم بھکری قابل ذکر ہیں جنھوں نے تاریخ معصومی کے نام سے سندھ کی تاریخ لکھی ہے جو چچ نامہ کے بعد سندھ کی دوسری تاریخ ہے۔ انھیں فن شعر میں مہارت تھی۔ نامی تخلص کرتے تھے۔ ان کی پانچ مثنویات بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے سندھ کی عشقیہ داستان 'سسی پنوں' کو 'مثنوی حسن و ناز' میں بیان کیا ہے۔ ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ ان کے والد سید صفائی بھی شاعر اور صاحب دیوان تھے۔

عہد اکبری کے مشہور ادیبوں اور شاعروں میں میر ابوالقاسم تمکین

اور ملا محب علی سندھی کے نام بھی قابل ذکر ہیں ۔ اسی زمانے میں عارف نامی سندھ کے ایک بلوچ بھی بڑے ادیب اور شاعر گزرے ہیں جن کا ذکر ملاشستری نے مجالس المومنین میں کیا ہے ۔ میر عبدالرشید ٹھٹھہ کے ایک نامور بزرگ تھے جنھوں نے جہانگیر کے عہد میں فرہنگ رشیدی نام کی ایک بہترین فارسی لغت لکھی ہے اور پھر شاہجہاں کے زمانے میں عربی فارسی کی لغت منتخب اللغات تصنیف کی ۔ عہد عالمگیری میں سید عبدالجلیل بلگرامی ان کے بیٹے سید محمد اور آزاد بلگرامی ایسے فارسی عربی کے عالم اور ادیب سندھ میں جلیل القدر منصب پر فائز رہے ۔ ان کی وجہ سے یہاں فارسی ادب اور شعر و سخن کا بڑا چرچا رہا ۔ سندھ میں بلگرامی سادات کے قیام نے فارسی ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہر طرح قابل ستائش ہیں ۔ میر ابوالمکارم شہود ابوالقاسم تمکین کے پوتے صاحب دیوان تھے ۔ ایک مثنوی پریخانہء سلیمان کے نام سے لکھی تھی، اس میں آم کی تعریف میں ان کے شعر ہیں۔ آزاد نے اپنا تذکرہ ید بیضا سندھ میں لکھا تھا ۔ اس زمانے میں سندھ نے فارسی کے کئی بہترین ادیب اور شاعر پیدا کیے جن کے تذکرے علی شیر قانع کی تحفۃ الکرام اور مقالات الشعرا میں پائے جاتے ہیں ۔ اس دور میں حکیم عبدالرؤف میر عبدالجلیل کے احباب میں سے تھے اور موسیقی میں ایک کتاب ابواب النغم کے نام سے لکھی ہے ۔

کلہوڑہ عباسیوں کے عہد میں جو ایک صدی سے بھی کم تھا ۔ فارسی ادب برابر ترقی پذیر رہا ۔ اس عہد کی کتابوں میں علی شیر قانع کی تصانیف تحفۃ الکرام اور مقالات الشعراء کے علاوہ سات مثنویاں ہیں ۔ شیخ ابراہیم ٹھٹھوی کی شرح مخزن اسرار، تحفۃ الطاہرین اور صید نامہ اس عہد کے فارسی ادب کے بہترین کارنامے ہیں ۔ اس دور میں سندھ کے دو خاص اور عدیم المثال فارسی کے ادیب مخدوم محمد معین تسلیم ٹھٹھوی متوفی ۱۱۶۰ھ اور ابو تراب میر حیدر الدین کامل تھے ۔ میر علی شیر قانع انھی کے تربیت یافتہ تھے ۔ فارسی کے دو بڑے دفتر اپنے شاگرد میاں محمد پناہ رجا کو دے تھے جو مکمل نہ ہونے پائے تھے کہ ۱۱۶۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ میر محمد صابری رضوی اگرچہ دلی میں پیدا ہوئے لیکن ۱۱۴۰ھ سے ٹھٹھے میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔بہت پر گو شاعر تھے اور ۱۱۷۳ھ تک بقول صاحب مقالات الشعراء تقریباً ایک لاکھ اشعار تصنیف کر چکے تھے ۔

انھی کلھوڑوں کے زمانے میں نادر شاہ سندھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ مرزا محمد علی ملقب بہ فردوسئی ثانی اسی کے ہمراہ سندھ آیا تھا جس نے نادر شاہ کے حالات میں شاہنامہ لکھا ہے، اس میں اس کا یہ شعر مشہور ہے:

بیک گردش چرخ نیلوفری نہ نادر بجا ماندے نادری

تالپوروں کے عہد میں جو تقریباً ایک صدی تک جاری رہا۔ اس میں امیروں نے فارسی ادب کی طرف خاص توجہ کی تھی اور ان کا دفتری کاروبار تمام تر اسی زبان میں ہوا کرتا تھا۔ فتح نامہ، چنیسر نامہ، مثنوی ہیر رانجھا، تکملۂ مقالات الشعراء، مکتوبات و ملفوظات محمد راشد، محمد ہاشم ٹھٹھوی اور سید ضیاء الدین ضیا کی تصانیف کے علاوہ خان بہادر خدا داد خان جاگیر دار سندھ نے ۱۳۱۸ھ میں لب تاریخ سندھ کے نام سے ایک تاریخ فارسی میں لکھی ہے۔ کرم علی، فتح علی، نواب تالپوری اور محسن کے دیوان بھی اسی عہد کی پیداوار ہیں۔

محک خسروی اور محک کمال دو بیاضیں ہیں جن میں سندھ کے فارسی شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے۔ انگریزوں کا دور اگرچہ فارسی ادب کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہیں رہا تاہم اس دور میں بھی بعض کتابیں فارسی میں تصنیف ہوئیں۔

سندھ میں فارسی ادب کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے جس کی تفصیل اور تشریح کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ سندھ میں فارسی کے سینکڑوں ادیب اور شاعروں کے کلام مقالات الشعراء میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تقریباً پانچ چھ صدیوں کی مسلسل علمی و ادبی کوششوں کا نتیجہ بے شمار تصانیف اور شعرا کے دواوین کی صورت میں نمودار ہوا ہوگا جس کا ایک بڑا حصہ دستبرد زمانہ سے تلف ہو گیا اور اس کے بچے کھچے آثار ان بیشمار خانگی کتب خانوں میں بند پڑے ہوں گے جو سندھ کے قدیم خاندانوں کے قبضے میں ہیں، اس لیے مملکت پاکستان کے علمی و ادبی مفاد کی خاطر نہایت ضروری ہے کہ یہ ذخیرہ تلاش کرکے اس کی اشاعت کی جائے اور اس کو عام دسترس کے قابل بنایا جائے۔

امیر خسرو اور تصوّف

آج تک ہند و پاکستان کی سر زمین پر جتنے صوفیائے کرام گزرے ہیں ان میں خواجہ امیر خسرو کی طرح کوئی جامع کمالات، اور بے نظیر صاحب فن نہیں ہوا۔ اعلیٰ اخلاق اور کردار کے ساتھ علم و فضل، تصوف اور معرفت، شعر و ادب، اور صنعت و فن میں امیر نے جن کمالات کا اظہار کیا ہے، وہ نہایت حیرت انگیز ہیں۔ دنیا میں ایسے انسان بہت کم ہوتے ہیں جو بیک وقت اتنی مختلف صفات کے حامل ہوں۔

علم و فن اور شعر و ادب کی دنیا میں تو امیر کی شہرت محتاج تعارف نہیں ہے۔ لیکن تصوف و معرفت میں ان کا جو مرتبہ اور مقام ہے اس کی بنا پر وہ تمام ارباب طریقت اور صاحبان قال کے نزدیک محبوب اور ہر دلعزیز ہیں، چنانچہ نامور بزرگان دین اور اکابر علما نے طریقت و معرفت میں آپ کو اعلیٰ مدارج پر فائض ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ آپ کی زندگی کے مختصر حالات یہ ہیں: آپ کے والد بزرگوار امیر سیف الدین ترکوں کے لاچین قبیلے سے اور ہزارہ بلخ کے امرا میں سے تھے۔ وہ ترک خاندان کے فرمانروا التوتمش کے عہد میں ہندوستان آئے اور دربار شاہی کے امرا میں منسلک ہو گئے اور اپنی قابلیتوں اور پسندیدہ اخلاق کی بدولت بلند مراتب حاصل کیے۔ انھوں نے پٹیالی میں قیام کیا عماد الملک جو اس زمانے کے امراء میں سے تھے ان کی صاحبزادی سے عقد کیا اور انھی کے بطن سے ۶۵۳ھ میں اور اسی گاؤں میں امیر پیدا ہوئے۔

دہلی کے ماتحت پٹیالی بڑا آباد شہر تھا اور آج صرف ضلع ایٹہ کا ایک گاؤں ہے ۔ ان کا نام ابوالحسن رکھا گیا تھا۔ لیکن

آگے چل کر اقلیم سخن میں خسرو کے تخلص سے ایسے مشہور ہوئے کہ آج تک دنیا انھیں صرف امیر خسرو کے نام سے جانتی پہچانتی ہے۔ صاحب سیر الا اولیا کا بیان ہے کہ امیر کو ان کے والد ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے جو مکان کے قریب رہتے تھے۔ ان کی نظر جب اس بچے پر پڑی تو کہنے لگے کہ تم ایسے شخص کو میرے پاس لائے ہو جو مشہور فارسی شاعر خاقانی سے بھی دو قدم آگے بڑھ جائے گا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے رائے زنی کرتے ہیں کہ ممکن ہے اُن مجذوب بزرگ کا مطلب ''دو قدم آگے'' سے مثنوی اور غزل ہو۔ جس میں امیر خاقانی سے بڑھ گئے اور قصیدے میں تو یقیناً اس کے برابر خیال کیے جاتے ہیں۔ امیر سیف الدین حکومت کی طرف سے کسی مہم پر بھیجے گئے اور میدان جنگ میں انھوں نے جام شہادت نوش کیا، اور امیر نو ہی برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے نانا امیر عمادالملک کے ہاتھوں ہوئی۔ مختصر عرصے میں انھوں نے مروجہ علوم و فنون میں بڑی مہارت پیدا کر لی۔ سلطان ناصر الدین بن التوتمش کے عہد میں مولانا شمس الدین بڑے متبحر عالم اور شعر و انشا پردازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سلطان غیاث الدین نے ان کو ''شمس الملک'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ مشہور شاعر تاج الدین ریزہ نے انھی کی مدح میں کہا ہے:

شمسا کنوں بکام دل دوستاں شہی

فرماں دہ ممالک ہندوستاں شہی

اس میں ان کے عہدۂ دبیرالانشا کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے درس میں بڑے بڑے بزرگ، اور اولیاء اللہ نے استفادہ کیا ہے جن میں حضرت سلطان المشائخ ملا قطب الدین نائلہ، ملا برہان الدین عبدالباقی وغیرہ۔ امیر خسرو نے اپنی کتاب غرۃ الکمال کے دیباچے میں اور مثنوی ہشت بہشت میں ان کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور ان کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے۔ امیر چار زبانوں کے ماہر تھے اور عربی، فارسی، ترکی اور ھندی نظم پر خاص قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی تصنیف سے صرف نظم میں (۹۹) کتابیں ہیں۔ بقول آپ کے آپ کے اشعار کی تعداد تین اور چار لاکھ کے درمیان ہے۔ دینی و دنیوی علوم و فنون کی تحصیل کے بعد امیر نے معرفت کے کوچے میں قدم رکھا اور حضرت شیخ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی قدس سرہ کے دست حق پرست پر بیعت کی اور ان کے مریدان

خاص میں سے ہوئے، چنانچہ فرماتے ہیں :

کالبد سوختہ بر جان رسید   مردہ بسر چشمۂ حیوان رسید
کار شناس از نظر دور بین   شد زدل تیرۂ من نور بین

ایک مرتبہ اپنے پیر طریقت کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور شیخ کی خدمت میں پیش کیا۔ شیخ نے بہت پسند فرمایا، ارشاد ہوا کہ اس قصیدے کا کیا صلہ چاہتے ہو۔ چونکہ امیر کو شعر و سخن سے شغف تھا، عرض کی کہ ''شیرینئی کلام'' عطا ہو۔ شیخ نے فرمایا میری چارپائی کے نیچے شکر سے بھرا ہوا پیالہ رکھا ہے اسے اٹھا لاؤ اور اس میں سے کچھ کھا لو اور باقی اپنے سر پر سے نچھاور کر ڈالو۔ امیر حکم بجا لائے، اس دن سے آپ کے کلام میں اس قدر شیرینی پیدا ہو گئی کہ جس نے آپ کا کلام سنا گرویدہ ہو گیا۔ امیر نے سات بادشاہوں کی ملازمت کی اور گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ خاندان غلامان کی سلطنت کا ان کے سامنے خاتمہ ہوا، پھر خلجیوں کا عروج بھی دیکھا، پہلے سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے ولی عہد محمد سلطان نے ان کو اپنی مصاحبت میں رکھا اور مصحف برداری کی خدمت پر مامور کیا۔ پانچ برس تک امیر شاہزادے کی مصاحبت میں رہے۔ جب وہ لڑائی میں شہید ہو گیا تو آپ نے چند روز گھر پر قیام کیا پھر سلطان غیاث الدین کے دربار میں دہلی پہنچے۔ چند روز کے بعد جب غیاث الدین کا انتقال ہو گیا تو اس کے ایک امیر علی میر جامدار نے جو بڑا اہل علم کا قدر دان تھا امیر کو عزت اور احترام سے اپنی مصاحبت میں رکھا۔ امیر نے اپنے دیوان میں اس کی مدح کی ہے اور اسپ نامہ اسی کے نام پر لکھا ہے۔ ۶۸۸ھ میں جب فیروز شاہ خلجی فرمانروا ہوا تو اس نے امیر کو مصحف برداری کے منصب پر بارہ سو تنکہ تقریباً بارہ سو روپے کی تنخواہ سے مقرر کیا۔ اس کی مدح میں بھی امیر نے قصائد لکھے ہیں۔ ۶۹۵ھ میں جب فیروز شاہ نے وفات پائی تو اس کے جانشین علاءالدین خلجی امیر کے ساتھ قدر دانی سے پیش آیا اور ایک ہزار تنکہ ان کی تنخواہ مقرر کی۔ ان کی تصانیف کا زیادہ حصہ اسی بادشاہ کے نام سے منسوب ہے۔ ۷۱۷ھ میں علاءالدین کے بعد قطب الدین مبارک شاہ تخت پر بیٹھا تو امیر نے اپنی مثنوی 'نہ سپہر' اس کے نام پر تصنیف کی جس کے صلے میں اس نے ہاتھی کے برابر ان کو زروجواہر عطا کیا۔ اس نے صرف چار پانچ مہینے حکومت کی اور اس کے بعد خسرو خان نے چار پانچ ماہ تک حکومت کی اور جب غازی الملک خسرو خان کو شکست دے کر ۷۲۱ھ میں غیاث الدین تغلق کے خطاب سے سریر آرائے سلطنت

ہوا تو اس نے امیر کو اپنی مصاحبت میں رکھ ، اور ان کی قدر افزائی کی۔ امیر کا مقام لکھنوتی میں تھا ، اس وقت حضرت سلطان المشائخ کا وصال ہو گیا' امیر کو خبر ہوئی تو لکھنوتی سے دلی پہنچے اور انتہائی جذبۂ محبت اور جوش و خروش میں اپنا سر مزار مبارک پر دے مارا اور چھ مہینے تک سوگوار ہو کر مزار شریف پر بیٹھ گئے۔ اسی صدمے سے اسی سال چھ ماہ کے بعد ان کا وصال ہو گیا اور حضرت شیخ کی پائنتی پاروں کے چبوترے پر مدفون ہوئے۔

مورخ ضیاءالدین برنی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ''امیر خسرو اگلے پچھلے شاعروں کے بادشاہ تھے۔ ایجاد مضامین اور کثرت تصانیف میں ان کا ثانی نہیں۔ان کی موزوں اور لطیف طبیعت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سر آمد اہل کمال بنا دیا تھا۔ اور ایک عدیم المثال ہستی پیدا کی کہ آخری زمانے میں ایسا نادرۂ روزگار پیدا کیا'' ۔

خواجہ امیر خسرو اس کثرت علم و فضل اور فنی مہارت کے ساتھ ہی نہایت متقی پرہیزگار اور مستقل مزاج صوفی تھے۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ عبادت اور نماز روزہ اور تلاوت قرآن مجید میں صرف کیا۔ آپ صاحب وجد و حال تھے اور علمی و عملی حیثیت سے فن موسیقی کے ماہر تھے' قوالی آپ ہی نے ایجاد کی جس کی بنا پر آپ کے شیخ طریقت حضرت محبوب الٰہی نے آپ کو ''مفتاح السماع'' یعنی ''گانے کی کنجی'' خطاب عطا فرمایا تھا۔ باوجودیکہ عمر بھر بادشاہوں اور سلاطین کی ملازمت میں رہے اور شعر و سخن کا مشغلہ رہا لیکن اپنے صوفیانہ مشاغل اور اوراد سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اسی بنا پر شیخ محدث دہلوی آپ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''اس قدر عالم و فاضل اور صوفی صاف طینت ہونے کے باوجود بادشاہوں اور امرا سے ان کا تعلق رہا اور خوش طبعی اور ظرافت سے ان کے ساتھ بسر کی لیکن آپ کا دل اس طرف متوجہ نہیں رہا اور اسی سے آپ کے آثار کی برکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل معصیت کے دل برکت سے خالی ہوتے ہیں اور ان کے آثار کو حسن قبول حاصل نہیں ہوتا''۔ جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں آپ نے طریق معرفت میں حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور حضرت نے خرقۂ خلافت عطا فرما کر آپ کو ترک اللہ کے خطاب سے مخاطب فرمایا۔ اور آپ ہمیشہ ہی ''ترک'' کہہ کر خطاب فرماتے۔ تھے۔ آپ کو اپنے مرید سے بے انتہا محبت و شفقت تھی اور آپ کو بھی اپنے پیر و مرشد پر

بے حد اعتقاد اور محبت تھی، مریدوں میں سے کسی کو یہ قرب میسر نہ تھا۔ روزانہ نماز عشا کے بعد حضرت شیخ کی خلوت خاص میں پہنچتے تھے اور ہر قسم کی گفتگو کیا کرتے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سے جس کو چاہتے حضرت شیخ کی خدمت میں لے آتے۔ صاحب سیر الاولیا کا بیان ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کی جو جو نوازشیں آپ کے حال پر ہوتی تھیں امیر ان کو قلمبند کر لیتے تھے۔ چنانچہ صاحب سیر الاولیا امیر کا بیان نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ قدس سرہ نے آپ سے فرمایا کہ میں ہر شخص سے تنگ آجاتا ہوں لیکن تم سے کبھی تنگ نہیں آتا۔ یہانتک کہ میں اپنے آپ سے تنگ آجاتا ہوں۔ دوسری مرتبہ بھی یہی فرمایا ایک شخص نے جرأت کرکے آپ کی خدمت میں عرض کی۔ امیر خسرو کے حال پر آپ کی عنایت کی جو نظریں ہیں ان میں سے ایک نظر میرے حال پر بھی عنایت ہو۔ آپ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن مجھ سے فرمانے لگے کہ جب اس شخص نے مجھ سے سوال کیا تو میرے دل میں آیا کہ اس کا جواب دوں کہ تم اتنی قابلیت تو پیدا کرلو۔ حضرت امیر ہمیشہ رات کو نماز تہجد کے وقت قرآن مجید کے سات پارے تلاوت فرماتے تھے، ایک دن شیخ نے آپ سے دریافت کیا کہ اے ترک تمھاری مشغولیتوں کا کیا حال ہے عرض کیا کہ مخدوم کچھ دنوں سے یہ حالت ہے کہ آخر شب میں مجھ پر رونے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ فرمایا الحمدللہ کہ اب یہ بات کچھ کچھ ظاہر ہونے لگی ہے۔

امیر کے ساتھ حضرت شیخ کی دلی محبت اور شفقت کے متعدد واقعات ملفوظات کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر یہاں موزوں اور مناسب ہوگا۔ ایک روز جمنا کے کنارے شہر کے ہندوؤں کا اجتماع تھا اور وہ جمنا میں اشنان اور پوجا کرنے کی مذہبی رسم ادا کرنے جمع ہوئے تھے، حضرت شیخ بھی یہ تماشا دیکھنے تشریف لے گئے تھے اور حضرت امیر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اہل ہنود کی اس رسم کے متعلق حضرت شیخ کی زبان سے یہ مصرعہ ادا ہوا کہ: ''ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ و گاہے''۔ اس وقت حضرت شیخ اپنے سر پر جو ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے وہ ذرا ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ امیر نے برجستہ عرض کیا: ''من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے''! حضرت نے اس پر تبسم فرمایا اور حضرت امیر سے اپنی انتہائی خوشنودی کا اظہار فرمایا یہ شعر اس قدر مشہور ہوا کہ عام طور پر صوفیائے کرام کی مجلسوں میں

قوال آہنگ و نوا کے ساتھ گاتے رہے۔ اور اس کے عجیب و غریب اثرات مترتب ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ جہانگیر بادشاہ نے اپنی مجلس میں شہر کے چند صوفی بزرگوں کو مدعو کیا تھا جن میں مولانا احمد علی سہرکن بھی تھے جو نسائی تخلص کرتے تھے اور بڑے صوفی صاحب باطن بزرگ اور اولیاء اللہ سے تھے۔ قوالوں نے اس شعر کو ساز پر گانا شروع کیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے اس پر یہ پورا واقعہ بیان کیا گیا اس کو سن کر مولانا احمد علی نے ایک نعرۂ عاشقانہ لگایا اور جان بحق تسلیم ہوگئے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر ان کے سر کو اپنے زانو پر رکھا۔ طبیبوں نے خیال کیا کہ سکتہ ہوگیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس شعر کے اثر سے ان کا وصال ہوچکا ہے۔

حضرت امیر کے صفات اور تصوف میں ان کے نکات اور اشعار بےحد و بیشمار ہیں۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ''امیر خسرو سلطان الشعرا اور برہان الفضلا ہیں، وہ اللہ تعالی کی دنیاؤں میں سے ایک دنیا تھے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور انھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا''۔

(اخبار الاخیار)

شبلی کی فارسی شاعری

(ایک مقالہ علامہ شبلی مرحوم کی اردو شاعری پر الہ آباد کی ہندستانی اکاڈمی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۳ و ۱۴ جنوری ۱۹۳۶ء میں پیش کیا گیا تھا، یہ دوسرا مقالہ ان کی فارسی شاعری پر ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس منعقدۂ ۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء میں پیش کیا جاتا ہے۔ اختر)

بزم را دید کہ از نغمۂ دو شینہ تہی است
شبلی آن زمزمہ را بازز آغاز گرفت

ہندوستان کے مسلمان فاتحین اکثر ایرانی اور تاتاری تھے، اس وجہ سے فارسی زبان ہندوستان میں ان کے ساتھ ساتھ آئی، اور زمانہ دراز تک یہ ملک فارسی زبان کا مرکز بنا رہا۔ مختلف اسلامی حکومتوں کے زیر سرپرستی، خصوصاً مغل بادشاہوں کے عہد زریں میں علوم و فنون نے انتہائی قدردانی اور ہمت افزائی کے زیر سایہ نشو و نما پائی۔ اسی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب نے بھی معتدبہ ترقی کی۔ تمام ملک میں فارسی زبان کی تحصیل لازمی سمجھی گئی، اور لوگوں میں زباندانی اور شعر و ادب کا عام مذاق پیدا ہوگیا، بلکہ علمی زبان کا درجہ فارسی کو نصیب ہوا، حتیٰ کہ ادبیات سے گزر کر دینیات تک اسی زبان میں لکھے جانے لگے۔ مدارس و مکاتب میں فارسی کی کلاسیکل کتابیں درسیات میں پڑھائی جانے لگیں۔ ایران کے مشہور اساتین شعر و ادب کی تصانیف نقل در نقل ہو ہو کر کثرت سے شایع ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ خود ہندوستان کے ارباب علم و دانش بھی فارسی زبان میں داد سخن دینے اور اس قند پارسی کی شیرینی سے لذت اندوز ہونے لگے۔ اس طرح ہندوستان میں اس فارسی کی بدولت عجم زندہ

ہوتا رہا۔ ایران کے سخنوران گرامی سلاطین مغلیہ کی دادودہش اور انعام و اکرام کا شہرہ سن کر مختلف شہر و دیار سے کھنچ کھنچ کر ہندوستان آنے لگے اور اپنے کمالات شاعری و زباندانی سے خواص و عوام کو بہرہ مند کرتے رہے۔ اہل ایران کے تتبع میں خود ہندوستان کے ادباء و شعراء نے بھی فارسی زبان و ادب کی کچھ کم خدمات انجام نہیں دیں۔ انہوں نے اس میں یہاں تک ترقی کی کہ بعض تو خود اہل زبان سے بھی سبقت لے گئے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فارسی کی ادبی تاریخ میں اہل ہند نے جو حصہ پیش کیا ہے وہ بہت گرانقدر ہے، جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ عہد مغلیہ کی دو صدیاں (سولھویں اور سترھویں) گویا شعر و ادب کا ایک طلائی دور تھا جس کو بقول ایک مستشرق کے ''بہار ہند'' سمجھنا چاہیئے، خود ہندوستان نے فارسی شاعری میں جو قابل قدر ہستیاں پیدا کیں ان کی فہرست تو بہت طویل ہوگی، تاہم اس سلسلے میں امیر خسرو، فیضی، بیدل اور غالب کا نام لینا کافی ہوگا، جن کے الہامات شعری نے خود اہل ایران کو بھی ششدر بنادیا۔

یادش بخیر! ہندوستان میں وہ قریبی زمانہ گذرا ہے جبکہ ''قند پارسی'' کی حلاوت سے کام‌ودہن لذت یاب تھے۔ جبکہ سوسائٹی کا ہر پڑھا لکھا فرد فارسی شعر و ادب کا دلدادہ نظر آتا تھا، اور اس غیر زبان میں اپنی مادری زبان کی طرح تحریر و تقریر بلکہ شعر گوئی تک پر قادر تھا افسوس کہ وہ بساط دیکھتے ہی دیکھتے الٹ گئی اور پچھلی نصف صدی میں فارسی کے ماہرین اور اس کے شعر و ادب کے متوالوں سے ہماری بزم سخن قریب قریب خالی ہوگئی، اور اب اس کا صحیح مذاق رکھنے والے ہندوستان کے طول و عرض میں صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ایسے زمانے میں جبکہ فارسی دانی ہندوستان سے رخصت ہو رہی تھی اور اس کا نفس واپسیں تھا، علامہ شبلی پیدا ہوئے۔ ہماری آخری بزم علمی کے مسند نشینوں میں سے یہ ایک تھے، اور ایک فاضل اجل اور جامع‌الصفات بزرگ تھے، جو مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، مؤرخ، ادیب اور انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ہی فارسی زبان کے اعلیٰ درجے کے نثار اور شاعر بھی تھے۔ اردو شاعری کے میدان میں مولانا ایک نئی شاہراہ کے بانی تھے، لیکن اس تنگ میدان میں ان کو جولانیٔ طبع دکھانے کا موقع نہیں ملا، اس لیے بفحوائے۔''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے''، ان کی شاعری کا

اصلی رنگ فارسی میں دیکھنا چاہیے، بقول غالب :

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

اس لیے ہم بھی ان کے اردو مجموعۂ کلام سے گزر کر خیابان عجم میں ان کی حسین گلکاریوں اور رنگین نقش آرائیوں کو دکھانا چاہتے ہیں، جو ان کی شاعرانہ قابلیت اور فارسی زباندانی کا طغراے امتیاز ہیں۔

مولانا شبلی کی فارسی شاعری
(آغاز اور مشق سخن)

تحصیلات علمیہ کے اثناء میں شعر و سخن کی طرف بھی مولانا کا رجحان ہوچکا تھا، پھر سوسائٹی اور اہل خاندان میں شعر و سخن کے چرچوں نے ان کی طبیعت پر اثر ڈالا، چنانچہ تکمیل تعلیم کے بعد ہی دیگر مشاغل علمی کے ساتھ ساتھ وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔ فارسی ادبیات سے شغف اور اساتذۂ عجم کا کلام بکثرت ازبر ہونے کے علاوہ صحیح وجدان اور فکر رسا نے مولاناؔ کے مذاق شاعری کو پختہ کردیا۔ پھر اس میں مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری اور علامہ فاروق چریاکوٹی مغفور ایسے باکمال اساتذہ کے فیض صحبت اور مشورۂ سخن نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ یہ دونوں بزرگوار اپنے وقت کے صرف اصمعی اور ابوتمام ہی نہیں بلکہ انوری اور سعدی بھی تھے اور عربی و فارسی میں شعر و سخن پر استادانہ قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ علامہ فیض‌الحسن کی وفات پر مولانا نے جو مرثیہ لکھا ہے اس میں ان کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے اس قابلیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

نگویم من تو خود انصاف دہ تا از کہ می آید
عرب را زندہ کردن وانگہ از ہندوستاں بودن
بہنجاردری بر جادۂ پیشینیاں رفتن
بآہنگ حجازی یادگار پاستاں بودن

علامہ چریا کوٹی کی نسبت خود مولانا کا بیان ہے:

"فارسی کا مذاق بھی انہی کا فیض ہے، اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری کے نکتے بتاتے"(۱)

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں بھی مولانا ان کو اپنا کلام دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ چنانچہ جب ۱۸۸۳ء میں اپنا فارسی کلام جمع کرکے

---

(۱) الندوہ اکتوبر ۱۹۰۹ء

چھپوا رہے تھے۔ اس وقت اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں :

> ''میں نے حضرت مولوی فاروق صاحب سے عرض کیا تھا کہ میرا فارسی کلام کسی قدر چھاپا جائے گا۔ اس واسطے اگر آپ اس کو دیکھ لیں تو بہتر ہے۔ حضرت موصوف نے منظور فرما لیا ہے، میرے پاس جو کلام ہے وہ بھیج دوں گا۔ مگر فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمھارے پاس ہیں نہایت جلد مولانا کے پاس بھیج دو''(۱)

بعض حضرات کا خیال تھا کہ مولانا کو خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی سے تلمذ تھا، لیکن اس کی تردید خود انھوں نے اپنے ایک خط میں کردی ہے۔ اور خواجہ صاحب سے اپنے دوستانہ روابط کا ذکر کیا ہے (۲)۔

مولانا کی فارسی شاعری کا آغاز ۱۸۷۶ء سے سمجھنا چاہیے جبکہ ہنوز ان کی عمر ۱۸ - ۱۹ برس سے زائد نہ تھی۔ اسی زمانے میں حجاز تشریف لے گئے۔ مکہ معظمہ سے مدینۂ منورہ حاضر ہوئے۔ ایک عالم وجد تھا جو عاشق رسول پر طاری تھا۔ اس عالم میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ فارسی زبان میں موزوں فرمایا جو سرتاپا شوق و آرزو ہے۔ (۳) قصیدہ جو ایک مسمط ہے ان کے ابتدائی زمانے کے کلام کا نمونہ ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

یا سائلی عن ذالخبر رحمی کہ امروزم دگر
از دیدہ شد خون جگر وزدود آہ بے اثر
آیند جہانم در نظر از بخت خود ہم تیرہ تر
تا کے توان کردن بسر آتش زدہ در جان و تن

عالم ہمہ خاک رہش قصر فلک عشرت گہش
وین بارگہ نہ تہش گشتہ کمینہ خر گہش
گیتی و این ہفت ونہش باشد غبار در گہش
در جلوۂ نور مہش روشن شد این نہ انجمن

---

(۱) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۶۸ - ۶۹،
(۲) ایضاً ج ۱ ص ۳۴۱،
(۳) سیر المصنفین جلد ۲ ص ۵۰۴، یہ قصیدہ اور قطعہ 'برگ گل' صفحات ۱۷ تا ۱۹ اور ۲۴ پر موجود ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پہلے تسنیم تخلص فرماتے تھے چنانچہ ان کے مجموعۂ کلام 'برگ گل' میں آغاز شباب کا کلام آخر میں درج کیا گیا ہے، اس میں ایک غزل کا مقطع یہ ہے :

کجا در بارگاہش بار بخشند چو تسنیم غریب بے نوارا

اس شعر پر یہ نوٹ لکھا ہؤا ہے کہ 'اول تخلص بہ تسنیم می کرد' - اسی طرح ایک غزل میں 'نعمانی' تخلص اختیار کیا ہے :

برسر کوی تو نعمانی آشفتہ و زار شادبنشستہ‌وترسم کہ‌حزیں‌می‌باشد

لیکن اس کے بعد سے وہ ہمیشہ اپنا تخلص شبلی ہی لکھتے رہے،

مولانا جب تک وطن میں رہے دیگر مشاغل ادبی کے ساتھ مشق سخن کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا مگر اس اثناء میں انھوں نے فارسی میں بہت کم لکھا، جیسا کہ ان کے ابتدائی زمانے کے کلام موجودۂ کلیات سے ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ ان کا بعض کلام ضائع ہوچکا ہے - ۱۸۸۲ء میں جب وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے تو وہاں بھی شعر و سخن کا مشغلہ ان کا مونس و دمساز تھا - قیام علی گڑھ کے زمانے میں وہ اکثر اردو اور فارسی میں مشق سخن کرتے رہے ہیں، جیسا کہ ان کے بعض مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے - چنانچہ اپنے ایک عزیز شاگرد کولکھتے ہیں :

'ان دنوں میں نے ایک واسوخت لکھا ہے - مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر اس کو لکھ سکا ہوں - واقعی نہایت پر درد ہے - واسوخت فارسی کے پندرہ بند ہیں یعنی ۹۰ شعر اور اسی قدر نامۂ اردو کے - حضرت استاد نے بھی واسوخت کو نہایت پسند کیا - میرا قصد تھا کہ صرف واسوخت اور نامہ سردست چھپ جائے' (۱)

افسوس ہے کہ واسوخت اور اردو نامہ دونوں سے ہم محروم ہیں، ورنہ ان سے مولانا کے ابتدائی زور کلام اور طرز سخن کا اندازہ ہوسکتا - اسی طرح ایک اور خط میں رقمطراز ہیں :

'ان دنوں غزلیں بہ تتبع علی حزیں لکھی گئی ہیں اور دلچسپ ہیں، افسوس ہے کہ گھر پر نہ لکھ سکوں گا یہاں کچھ سامان پیدا ہوگئے ہیں اگرچہ ضعیف ہیں' (۲)

---

(۱) مکاتیب ج ۱ : ص ۶۸ - ۶۹

(۲) مکاتیب ج ۱ص ۷۲،

اسی زمانے میں شیخ علی حزیں کی غزل پر مولانا نے ایک غزل لکھی تھی، اس کے متعلق ایک واقعہ انہوں نے لکھا ہے جو ان کے ابتدائی دور شاعری سے متعلق ہونے کے لحاظ سے ہم یہاں اس کو خود مولانا کی زبانی نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں :

'چہ کنم کی ردیف کی غزل پر یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ چند لڑکوں نے کہا کہ استاد (علی حزیں) کی غزل پر غزل لکھنی اس سے کیا حاصل ۔ ہمنائے فلک نہ ہوگا بادل ۔ میں نے کہا ۔ دریا نہیں کاربند ساقی ۔ غرض میری اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف قیصرنامہ اور نیر دہلوی کے پاس بغرض محاکمہ ارسال کی گئی دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے ۔ نیر نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ دونوں صاحبوں کا خط میں نے رکھ چھوڑا ہے۔ خط میں یہ نہیں ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ غزلیں کس کی تصنیف ہیں، بلکہ اسی لیے دونوں مقطع اڑا دیے تھے'(۱)

اس تحریر سے جہاں مولانا کے مشق سخن کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں بھی ان کو فارسی شعر و سخن پر خاصی قدرت حاصل تھی،

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

'سنیے ایک بہار یہ قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا ۔ اگرچہ ابھی صرف ۲۷ شعر ہوئے مگر امید سے بڑھ کر ہوئے ۔ غالباً غالب سے کم رتبے کا نہ ہو'(۲)

یہ وہی بہاریہ قصیدہ ہے جو ناتمام رہا اور صرف اس کے ۱۸ شعر ان کے کلیات میں پائے جاتے ہیں ۔ یہ قصیدہ مرزا غالب کی ردیف و قافیہ میں(۳)

---

(۱) مکاتیب ج ۱ ص ۵۷

(۲) مکاتیب ج ۱ ص ۸۴،

(۳) مرزا کا یہ قصیدہ (نمبر ۸۷) ان کی کلیات نظم صفحہ ۳۳۳ پر موجود ہے اس کا مطلع یہ ہے :

عیداضحیٰ بسر آغاز زمستان آمد
وقت آراستن حجرہ و ایوان آمد

لکھا گیا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

دوش ایں مژدہ بگوش گل و ریحاں آمد
کہ بہار آمد و بسیاو بسلماں آمد

معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مولانا اپنے کلام میں تغیر و تبدل کے ساتھ اپنے اشعار کو گھٹاتے بڑھاتے رہتے تھے، چنانچہ اپنے عیدیہ قصیدے کے متعلق جو ان کی کلیات میں سب سے پہلے درج ہے، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

'میں نے عیدیہ قصیدہ میں آجکل ایک تقریب سے کچھ تغیر کیا ہے، کوئی ۲۶ شعر بڑھادیے ہیں، مگر اتنے ہی اصل سے نکال بھی دیے، واقعی یہ شعر جو بڑھائے گئے بلند پایہ ہیں'(۱)

علی گڑھ کالج میں خاص خاص تقریبات پر مولانا کو نظمیں لکھنے کا موقع ملتا رہا۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کی تشریف آوری کے موقع پر سید محمود صاحب کی فرمائش سے مولانا نے چند بند فارسی میں لکھے جو کھانے کے بعد پڑھے گئے، پہلا بند یہ ہے۔

اے دل ایں مایہ انتظار کہ بود — آخر ایں مستی از خمار کہ بود
چشم شوقت برہگذار کہ بود — ہوس سرمۂ غبار کہ بود
ایں ببیں خانہ جلوہ گہ کہ است — پردۂ دیدہ فرش راہ کہ است

اس نظم کے متعلق خود مولانا کا بیان ہے کہ جب یہ پڑھی گئی تو ''عجب سماں بندھ گیا، تمام حضار مجلس حقیقت میں بیتاب ہوگئے۔ سید محمود صاحب اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی کئی بارپڑھواتے تھے۔ وزیر صاحب نے بڑھ کر کہا افسوس ہے کہ ان شعروں میں آپ نے میرا ذکر کیا ہے ورنہ میں اس کی داد دیتا''(۲)

قیام علی گڑھ کے زمانے میں تعلیمی ملازمت کے ساتھ ہی کچھ ایسے دلچسپ اسباب فراہم ہوگئے تھے کہ شعر و سخن کے لیے یہ اسلامی ادبستان بہت سازگار ثابت ہوا۔ اہل علم اساتذہ کی صحبت، نامور اہل علم و فن کا ورود، اور خود سرسید مرحوم ایسے مس کو کیمیا بنانے والے بزرگ کی معیت، پھر سخن شناسانہ تحسین اور منصفانہ داد شاعر کی حوصلہ افزائی میں بہت مددگار ثابت ہوئے۔ کالج کی پرسکوت فضا، اور تنہائی نے شعر و سخن کا پورا موقع دیا تھا، جس کا تذکرہ مولانا نے اپنے مکاتیب میں کیا

(۱) مکاتیب ج ۱ ص ۹۷
(۲) مکاتیب ج ۱ ص ۷۹-۸۰،

ہے،(۱) بعض اوقات مقامی شعراء اور ارباب سخن سے ملاقاتیں رہتی تھیں اور شعر و سخن کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق مولانا رقمطراز ہیں:

"میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اردو ہیں رہتے ہیں مجھ سے اکثر ملتے ہیں اور قیس تخلص کرتے ہیں"۔

"میر اکبرحسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے۔ میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سنے اور داد دی۔ مدرسے کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں"

غرضیکہ ایسے علمی ماحول اور ادبی فضا میں مولانا کی شاعری پرورش پاتی رہی اور ان کا ذوق سخن ترقی کرتا رہا۔ لیکن ایک خاص بات جو مولانا کو دوسرے پیشہ ور شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے خود مولانا بھی شاعری کو اپنا وظیفۂ طبعی سمجھتے تھے اور باوجود کثرت اشغال اور علمی مصروفیتوں میں گھرے رہنے کے بھی ان کی شعر گوئی کا مشغلہ بھی پہلو بہ پہلو جاری رہتا تھا۔

مولانا نے طبیعت بھی بہت حساس اور اثر پذیر پائی تھی۔ اور یہ ان کی شاعرانہ طبیعت کا تقاضا تھا کہ ہر واقعے سے بےحد بتأثر ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا سخت واقعہ ان کے ایک پاؤں کا بندوق سے اڑ جانا تھا۔ شعر العجم تصنیف ہورہی تھی، شاہنامہ پر ریویو لکھتے ہوئے فردوسی کے اشعار ذیل زیر رقم تھے:

بروز نبرد آن یل ارجمند	بہ تیغ و بہ تیر و بگرز و کمند
برید و دریدو شکست و بہ بست	یلاں را سرو سینہ و پا و دست

اس اثناء میں زنانے میں تخت پر آکر بیٹھے، اتفاقیہ بندوق سر ہوگئی اور مولانا کا پاؤں نشانہ بن گیا، اور زانو سے نیچے قریباً سارا پاؤں اڑ گیا۔ بقول مولانا شروانی 'مردان جنگ آزما جس تمنا میں ساری عمر رہتے ہیں وہ ان کو گھر بیٹھے مل گئی'۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگان بدعا آرزو کنند!

اہل علم کی زندگی کا ہر پہلو علمی دلچسپی کا سامان بن جاتا ہے۔

(۱) مکاتیب ج ۱ : ص۵۳

یہ حادثہ بھی بہت سے ادبی نکات و لطائف کا باعث ہوگیا۔ چنانچہ اس کا ذکر ایک معنی خیز انداز میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

حالت از گردش ایام اگر گشت بتر
صبر فرما کہ ازیں نیز بتر می بایست
شبلی نامہ سیہ را بجزاے عملش
پا بریدند و صدا خاست کہ سر می بایست

اس حادثے کے موقع پر مولانا کے احباب اور قدر شناسوں نے مختلف قطعات اور رباعیات فارسی اور اردو میں لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھیجے تھے جن میں لنگ کی رعایت سے شاعرانہ لطائف نظم کیے گئے تھے۔ لکھنے والوں میں خواجہ عزیز، مولوی اقبال احمد سہیل، نواب علی حسن خاں وغیرہ تھے۔ خود مولانا کے استاد علامہ چریا کوٹی نے بھی چند شعر مثنوی میں لکھ کر بھیجے۔ نیز مولانا حالی نے ایک رباعی بھیج کر اپنے تئیں مولانا کے ہوا خواہوں کے زمرے میں شامل کیا تھا۔

اس سلسلے میں سفر کشمیر کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ ہر سال گرمیوں میں مولانا اکثرسرد مقامات پر چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۳ء میں گرمیاں بسر کرنے کے لیے وہ کشمیر تشریف لے گئے۔ وہ کشمیر جنت نظیر جہاں بقول عرفی 'مرغ کباب' کے بھی بال و پر نکل آتے ہیں، مولانا کے حق میں مضر صحت ثابت ہؤا، اور اس بلبل ہند کو وہاں کے بخار نے سوختہ جان کردیا۔ چنانچہ یہ سفر ''قصیدۂ کشمیر یہ'' کا باعث ہؤا جو مولانا کے کلیات میں شامل اور ان کی ابتدائی عہد کی قادرالکلامی کا بین ثبوت ہے، کشمیر کی پر بہار وادی اور وہاں کی دلکشا نزہت گاہوں اور دل آویز نظاروں کا نقشہ شاعر کے موے قلم نے اس طرح کھینچا ہے :

بسکہ جوشید ز ہر سوی گل و لالہ بدشت
از کران تابہ کران روی زمیں ناپید است
ہیچ جاۓ ز گل و لالہ تہی نتوان یافت
پاۓ دیوار اگر ہست د گر سقف سر است
جادہ را خود ز خیابان نتوان کرد تمیز
بسکہ گل صف زدہ سرتاسر او از چپ و راست
جام گلرنگ کہ در بزم بآئیں چینند
ہم بدان گونہ گل از پہلوئ گل جلوہ نماست

نقشبند چمن طبع ز تردستئ فیض
دشت را ہم ز گل و لالہ و شمشاد آراست
سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سرتاپاہن
یا قبائیست کہ بر قامت شخص آید راست
راہرو را ندہد دل کہ نہد گام ہمراہ
بسکہ بر ہر قدمش لالہ ز گل درتہ پاست
دیدۂ طفل کہ بر دامن مادر غلطد
جنبش باد بدانگونہ بروی صحراست
گل بہ ہر شاخ ز برگہ است فزوں تر گوئی
ہمہ برگل بفزود آنچہ کہ از برگ بکاست
سرو اگر پاے بدامن نکشد خود چہ کند
زانکہ از جوش گل و لالہ چمن تنگ فضاست
آبگیرے کہ بشہر است و بود نامش ڈل
گوئیا آئینہ در دست عروسے زیباست
شالمارست و نشاط است ونگین است و نسیم
باغہائے کہ بہ پیرامن ڈل غالیہ ساست
شالجبار است ازاں جملہ فزوں تر بجمال
کہ چو تہ چرخ طبق بر طبق و تا برتاست
آب بالائے زمیں بناشمد و اینجا بیئی
کہ زمیں بر سر آبست و ہماں پا برجاست
درین آب دمد سبزہ و نیلوفر و گل
قبوت نسامیہ بنگر زکجا تا بکجاست

علی گڑھ کالج میں مولانا ۱۸۹۷ء تک رہے۔ سرسید کی وفات کے بعد کالج کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوئیں، اور حالات کچھ ایسے ناقابل برداشت ہو گئے کہ مولانا ملازمت کو ترک کرکے وطن چلے آئے۔ پھر کچھ عرصے تک انجمن ترقی اردو کے ناظم کی حیثیت سے حیدرآباد میں رہے، وہاں صیغۂ تصنیف و تالیف قائم کیا۔ اسی اثناء جبکہ وہ حیدر آباد میں ناظم علوم و فنون تھے انھوں نے ایک مشرقی یونیورسٹی کا نظام بھی مرتب کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کی وہ روح رواں تھے۔ اگرچہ ندوہ کے قیام نے نیز علمی کتابوں کی تصنیف نے مولانا کو ایک مدت تک شعر و شاعری سے باز رکھا، لیکن خاص

خاص مواقع پر اس کا ظہور ہوتا رہا ۔ ندوہ کے سالانہ جلسوں میں جو پر جوش اور شاندار قصائد اور نظمیں پڑھی گئیں وہ زیادہ تر فارسی زبان میں تھیں ۔ اگرچہ ندوہ کا میدان شعر و سخن کے لیے تنگ تھا، تاہم فطری جذبات کبھی کبھی شعر و سخن کے مذاق کو ابھارتے رہتے تھے ۔ اس کشمکش سے بعض مرتبہ تنگ آ جاتے تھے، چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

''ندوہ کی جھنجھٹ اور شاعری ساتھ چلنے کی چیزیں نہیں ہیں ۔ لیکن بہر حال چارہ بھی نہیں۔ ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی کس کو چھوڑوں پھر انھیں پر موقوف نہیں 'یك دل و هزار سودا' خیر بہر حال گذر جاتی ہے''(۱)

یہ واقعہ ہے کہ شاعری کا شوق مولانا کو اوائل عہد سے تھا جو بتدریج ترقی کرتا رہا ۔ اگرچہ قومی اور علمی مشاغل اس پر غالب آ گئے لیکن ان مصروفیتوں کے باوجود بھی ذوق شاعری جو ابتدا سے طبیعت میں رچا ہوا تھا ان سے شعر لکھوا کر رہتا تھا ۔ شعر العجم در اصل اسی شاعرانہ ذوق و شوق کی یاد گار ہے۔ فلسفہ و کلام اور تاریخ و سیر ایسے خشك موضوعات کے ساتھ ساتھ ادبیات کا ظہور تمام تر اسی رنگ طبیعت کا نتیجہ تھا ۔ چنانچہ ایک خط میں مولانا حمید الدین مرحوم کو لکھتے ہیں :

''میں ایک کتاب شعرالعجم لکھنی چاہتا ہوں، گو فرصت نہیں لیکن بچپن سے آج تک کا مذاق ضائع کرنے کو جی نہیں چاہتا'' (۲)

اسی طرح اپنے عزیز دوست مہدی حسن مرحوم کو لکھتے ہیں :

''ندوہ میں رہ کر تصنیف سے تقریباً معذور ہو گیا تھا ۔ اس لیے میں نے تین مہینے کی رخصت لی کہ اطمینان سے شعر العجم کو پورا کروں ۔

بلا سے گو مژۂ یار تشنۂ خوں ہے

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کے لیے (۳)

ان تحریرات سے ثابت ہوتا ہے کہ شعر و شاعری مولانا کا ذاتی اورطبعی شوق تھا جس کو وہ ہر حالت میں پورا کرتے رہے ہیں ، اور جو دیگر غالب مصروفیات کے باعث رکا رہتا تھا ۔

مولانا کا کلیات فارسی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زمانے تک

---

(۱) مکاتیب ج ۱ ص ۱۰۳

(۲) مکاتیب ج ۲، ص ۳۲

(۳) مکاتیب ج ۲، ص ۲۱۳

قصائد، نظمیں، قطعات، ترکیب بند، مثنویات، مرثیے وغیرہ لکھتے رہے، جن میں سے بعض فرمائشی، بعض موقع کی رعایت سے اور بعض دلی جذبات کی تحریک سے لکھے گئے ہیں، لیکن مولانا کی فارسی شاعری کے اصلی جوہر غزل میں کھلتے ہیں جس کی نسبت ہمارے ایک مشہور ادیب کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے:

''دوسری طرف شبلی کی جرأت رندانہ برسرکار آئی اور علم و فضل کے خزانے ایک وجدان حقیقی پر قربان کیے جانے لگے''۔ اس جرأت رندانہ کا اشارہ مولانا کے اس شعر کی طرف ہے:

کنار و بوس او یك جرأت رندانه می خواهد
ازو ناکامی ماهم زما بوده است دانستم (۱)

اگرچہ ابتدا میں کچھ غزلیں بھی انھوں نے لکھیں جو ان کے دیوان کے آخر میں مکمل اور ناتمام چھپ گئی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے تغزل کا اصلی دور ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتا ہے جو کہنے کو تو ۱۹۱۳ء تک قائم رہا لیکن صحیح یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء کے بعد سے ختم ہو گیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی، ان حالات کے ماتحت مولانا کی شاعری کے تین دور قائم کیے جا سکتے ہیں:

پہلا دور— ۱۸۷۶ء سے لے کر ۱۸۹۶ء تک کا جب تک کہ وہ علی گڑھ کالج میں رہے۔

دوسرا دور— ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کا جبکہ وہ حیدر آباد میں تصنیف و تالیف کے اہم علمی کاموں اور ندوہ کی کاروائیوں وغیرہ میں ہمہ تن مصروف رہے۔

تیسرا دور— ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک۔

ان ادوار ثلثہ کی تقسیم اس لیے کی گئی ہے کہ ان میں مولانا کی شاعری کا رنگ مختلف رہا ہے۔ زور سخن اور آمد کے لحاظ سے ابتدائی اور آخری دور بڑھ کر ہے۔ دور اوسط اس لحاظ سے بھی اہم نہیں ہے کہ اس عرصے میں مولانا نے شعر و سخن کی طرف بہت کم توجہ کی۔

ابن مقلہ کا قول ہے کہ الشعر تطر بالاً تطلباً یعنی تفریح طبع کے لیے شعر کہنا چاہیے نہ کہ حصول زر کے لیے۔ اس اصول کے مطابق مولانا نے

---

(۱) رسالۂ جامعہ جولائی۔ اگست، ۱۹۲۴ء ''اردو زبان کی قومی شاعری'' از قاضی عبدالغفار صاحب

شاعری کو کبھی پیشہ نہیں بنایا ۔ جو کچھ کہا اپنے جذبات کی رعایت سے کہا ۔ خود بھی فرماتے ہیں:

''میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے یہ جو کبھی کبھی موزوں کر لیتا ہوں یہ شاعری نہیں ، تفریح طبع ہے(۱)

مختلف اصناف سخن :

فن شعر میں مولانا کی دسترس اور قادر الکلامی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، مرثیہ، غزل، قطعہ اور رباعی ان تمام اصناف میں انھوں نے شعر کہے ہیں ۔ اور اصول فن کا سر رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ۔ اگرچہ ہر صنف میں استادانہ اور مجتہدانہ شان دکھائی ہے ۔ لیکن مثنوی سے بہتر وہ قصیدہ کہے ہیں ، اور قصیدے سے بڑھ کر غزل، مولانا کوئی پیشہ ور شاعر نہ تھے۔ نہ ان کی عالی حوصلگی اور بلند فطرت نے کبھی مداحی کو جائز رکھا ۔ اس لحاظ سے چند قصائد جو آن کے کلیات میں پائے جاتے ہیں ، ایک حضور نظام کے قصیدۂ تہنیت کے سوا، تمام تر مقررہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں ۔ ایک اور مختصر قصیدۂ تشکر رئیسہ بھوپال (مرحومہ) کی مدح میں لکھا ہے اور گو اس میں شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا گیا ۔ با ایں ھمہ مقطع میں فرماتے ہیں :

شبلیٔ غمزدہ را مدح شہاں شیوہ نبود
لیک لطفت ھمہ را بندۂ احساں کردہ است

جہاں تک بحر، قافیہ اور ردیف کا تعلق ہے ، قصیدے تمام تر غالب کی زمینوں میں لکھے گئے ہیں ۔ جو زبان اور زور بیان کے لحاظ سے کلاسیکل شان رکھتے ہیں ، مگر غالب کی سی معنویت، بلند پروازی اور جدت مضامین ان میں تلاش کرنا بیکار ہے ۔ بہر حال ان میں قصیدہ بہاریہ (ناتمام) خوب ہے جس کے غالب سے کم رتبہ نہ ہونے کا خود مولانا دعویٰ کر چکے ہیں ، اس کا مقابلہ غالب کی تشبیب سے کرتے ہیں تو مولانا کا یہ دعویٰ ہمیں ایک حد تک بجا معلوم ہوتا ہے ۔

---

(۱) مکاتیب ج ۱، ص ۳۴۱

ترکیب بند میں مولانا اپنے خاص اسلوب بیان کے ساتھ حکیمانہ خیالات اور شاعرانہ جذبات کو ملا دیتے ہیں ، جس کی وجہ سے پوری نظم شاندار اور مرصع معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ندوۃ العلما کے سالانہ جلسۂ منعقدہ امرت سر ۱۹۰۲ء میں انھوں نے جو ترکیب بند پڑھا تھا وہ اس صنف میں ان کا ایک شاہکار ہے۔ ذرا اٹھان ملاحظہ ہو :

ایکہ پرسی چہ کسانیم و چہ سامان داریم
آنچہ با ہیچ نیرزد بجہان آن داریم
مانہ آنیم کہ دیہیم سکندر طلبیم
مانہ آنیم کہ اورنگ سلیمان داریم
مانہ آنیم کہ بر شیوۂ ارباب حشم
روی و راہے بدر دولت سلطان داریم
مانہ آنیم کہ با حاجب و دربان باشیم
مانہ آنیم کہ بام و در و ایوان داریم
مانہ آنیم کہ با مسند و بالین ارزیم
مانہ آنیم کہ سرداب و شبستان داریم

مثنویات میں ان کی وہ مثنوی خوب ہے جس میں اپنے ایک دوست کی زبانی قدیم طرز سخن پر اعتراض کرتے ہوئے شاعری میں جدید طرز اختیار کرنے کے متعلق فرماتے ہیں:

زیں بساط کہن چو برخیزم ۔ پیکر تازۂ بر انگیزم
رسم دیرینہ را بر اندازم در سخن طرح دیگر اندازم
بد مم خلق را فسون دگر کردہ ام ساز ارغنون دگر
تا بسنجی کہ با کمال سخن تنگیٔ نیست در مجال سخن
ایں روش گر قبول دوست نبود می تواں جادۂ دگر پیمود

شاعری نہ ہمیں سخن سازیست
کہ دریں پردہ گونہ گوں بازیست

مولانا کے کلیات میں کل پانچ مرثیے ہیں ، جن میں ان کے استاد مولانا فیض الحسن مرحوم کا مرثیہ، فن اور جذبات کے لحاظ سے بہترین ہے۔ یہ ایک ترجیع بند ہے جس میں ۳ بند ہیں۔ پہلے بند میں اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا ہے ، دوسرے بند میں متوفی کی صفات کا بیان ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل

اشعار خوب نکالے ہیں :

چو در دل داشتی آخر زیاران برکران بودن
دو سه روزی دگر بایستی آخر میهمان بودن
خود این را سهل می گیریم کز ما دامن افشاندی
بحال فن همی بایست آخر مهربان بودن
نگویم من تو خود انصاف ده تا از که می آید
عرب را زنده کردن وانگه از هندوستان بودن
نو آئین نکته‌ها در ایزدی فرمان نشان دادن
بکشف راز دین روح القدس را ترجمان بودن
بهنجار دری بر جادۂ پیشینیان رفتن
باهنگ حجازی یادگار پاستان بودن
نکیرین از کجا سنجند لطف طبع رنگینت
بنا فہماں ندانم چوں پسندی همزبان بودن

خاص کر آخری شعر بہت دلچسپ ہے جو مرزا غالب کے مرثیۂ عارف کے اس شعر کو یاد دلاتا ہے :

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

کلیات شبلی میں جتنے مرثیے ہیں وہ سب ۱۸۸۵ء کے بعد کے ہیں۔ لیکن مولانا کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۸۱ء میں کوئی مرثیہ لکھا تھا جو غالباً ان کے اور کلام کی طرح ناپید ہو گیا۔ اس کے متعلق اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں :

'مرثیہ (جو تم بھی دیکھ چکے ہوگے) لوگوں نے اس کی فارسی دیکھی ہے از بس پسند فرمائی ہے۔ میر اکبر حسین صاحب بھی ان میں داخل ہیں' (۱)

غزل کے میدان میں مولانا ایک خاص شان سے یکہ تاز ہوئے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے بمشکل سو غزلیں لکھی ہیں ، لیکن اس محدود پرایۂ بیان میں بھی انھوں نے جس جامعیت، حسن بیان اور رنگینی کے ساتھ جذبات کا اظہار کیا ہے وہ اس فن میں ان کو ہندوستان کے ممتاز غزل سراؤں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ بہ نسبت دیگر اصناف سخن کے چونکہ غزل میں مولانا کی

---

(۱) مکاتیب ج ۱، ص ۵۴

شاعری کا جوہر زیادہ چمکا ہے اس لیے ہم ان کی غزل‌سرائی کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں ، اور اس کے لیے ''شبلی اور غزل،، کا ایک مستقل عنوان قائم کرتے ہیں ۔

شبلی اور غزل :

ہندوستان آنے والے شعرائے ایران کا اسکول جن میں عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، ظہوری ترشیزی، صائب اصفہانی، ابو طالب کلیم اور علی حزیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں ، اس آخری اسکول کے متبعین میں وہ ہندوستانی شعرا ہیں جنھوں نے نہ صرف فن شعر خصوصاً اس کی ایک صنف غزل میں کمال حاصل کیا، بلکہ ان میں سے بعض تو خود شعرائے عجم سے سبقت لے گئے ۔چنانچہ فیضی، ناصر علی، بیدل اور غالب ہندوستانی شعراء میں خاص طور پر مشہور ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ غالب پر فارسی غزل گوئی کا خاتمہ ہو گیا ، لیکن زمانۂ غدر کے بعد ہندوستان کے فارسی شعرا جو غزل گوئی میں مشہور ہوئے ان میں علامہ شبلی ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے ۔ اگرچہ وہ ہندوستانی اسکول ہی کے ایک مقلد و متبع کہے جا سکتے ہیں ، لیکن غزل میں جس حسن بیان، لطیف طرز ادا، روزمرہ اور قادر الکلامی کے ساتھ جو معنی آفرینیاں انھوں نے کی ہیں وہ یقیناً ان کو اپنے دیگر معاصرین میں ایک خاص وقعت اور امتیاز کا مستحق ٹھیرانی ہیں ۔

اگرچہ مولانا نے ابتداء اپنے عالمانہ وقار کو قائم رکھنے کے خیال سے نیز غزل کی مبتذل روش سے احتراز کرتے ہوئے غزلیہ اشعار بہت کم کہے ہیں ، اور غالباً ۱۸۸۷ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک غزل کہنے کا ان کو اتفاق ہی نہیں ہوا(۱)۔ لیکن ان کی شاعری کا آخری دور غزل‌سرائی کے لحاظ سے بہت یادگار رہے گا کہ اس دور میں انھوں نے غزل کے میدان میں مردانہ وار قدم رکھا، اور بقول ادیب شہیر ان کی جرأت رندانہ' برسرکار آئی اور علمیت و تبحر کے سارے خزانے ایک وجدان حقیقی پر قربان کیے جانے لگے' ۔ اس غزل‌سرائی کی بدولت یاروں نے عاشقی کی تہمت لگائی چنانچہ فرماتے ہیں :

شبلیا نابلد کوچۂ عشقیم ولی — دوستان تہمت ایں شیوہ بمانیز کنند

---

(۱) مکاتب ج ۲، ص ۲۰۷

لیکن اس کے جواب میں خود مولانا کا یہ مقطع بھی پیش کیا جاسکتا ہے:

هر چند غلط نیست که شبلی دل و دیں باخت
این حرف ولی مصلحت آمیز نبوده است

مولانا حسرت کا جواب بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے، فرماتے ہیں:

'علامہ شبلی انکار کیے جائیں لیکن ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شیوۂ دلپذیر کو وہ تہمت دوستاں، سے تعبیر کرتے ہیں اس سے ان کی شاعرانہ طبیعت بہرۂ وافر رکھتی ہے۔ اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

گردم از مدحت شیراز و صفاهان زده ام
شرم بادم که نواهای پریشان زده ام
بمبئی بود مرا منزل مقصود و عبث
پیش ازیں گام طلب در ره حرمان زده ام
اندکی نیز بکام دل خودبیں باشم
روزگاری چو دم از دانش و عرفان زده ام
چند در پرده توان گزد سخن فاش بگو
سنگ بر شیشۂ تقوی ز ده ام هان زده ام
جامۂ زهد چو بر قامت من راست نبود
شیشۂ تقوئ سی ساله به سندان زده ام
آن شد اے دوست که آراستمی پیکر فن
نقش زیبا صنمی بر ورق جان زده ام
آن شدا ے دوست که درندوه به بینی یازم
که دم از صحبت آن دشمن ایمان زده ام
هان و هان دست بدارید زمن اے احباب
که به زیبا صنمی دست به پیمان زده ام
پی توان برد که ایں زمزمه بی چیزی نیست
شبلی این تازه نواهانه چوستان زده ام

غزل میں مولانا نے اساتذہ کا تتبع کیا ہے، اور اگرچہ یہ نری تقلید ہی

تقلید ہے، تاہم ایک غیر زبان میں شعر کہنا، اور اس میں اہل زبان کی طرح ایک ایک محاورے کا خیال رکھتے ہوئے اس طرح بے ساختہ شعر کہنا واقعی مشکل ہے۔ لہذا اس میں شک نہیں ہے کہ مولانا اس میں بہت کامیاب رہے، اور جہاں تک غزل کے خارجی موضوعات حسن و عشق، ہجر و وصل، جور و جفا، نالہ و فریاد، شمع و بزم، گل و بلبل، خط و خال، چشم و ابرو، زلف و گیسو، بوس و کنار، رندی و مستی، شوخی اور نظر بازی کا تعلق ہے، ان کی غزلیں گرما گرم ہیں، اور فارسی غزل کے ان پامال مضامین کو خاص طرز، بہترین انداز بیان، رنگین تشبیہات و استعارات کے ساتھ بیان کرنا مولانا کا حصہ ہے۔ خود بھی فرماتے ہیں :

حدیث عشق خوش بوده است وشبلی خوشترک کرده است

شنیدن میتوان زین حرف رنگیں داستانی را

چند اشعار مشتے نمونے از خروارے پیش کیے جاتے ہیں :

۱ بادہ ہر چند تہ خرقہ تواں نیز کشید

نرگس مست کسی خواست کہ رسوا باشم

۲ من فدای بت شوخی کہ بہنگام وصال

بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

۳ بخت بدبیں کہ بہ ہجران تو برسرزدہ ام

دست شوقی کہ دران طوق کمرمی بایست

۴ بیحاصلی نگر کہ بایں دوری از رخش

صد جائی بہر بوسہ نشان کردہ ایم ما

۵ شب‌وصلی ازویاآن درازی آرزو دارم

کہ یک‌یک برشمارم حلقہ ہائے زلف‌پیچاں را

۶ بہ بوسہ دل نوازی کردی اما

ازیں ہم خوبتر کاری تواں کرد

۷ بہ شکر خندۂ لطف تو تسلی نشوم

من کہ خو کردۂ آن غمزۂ پنہان باشم

۸ گرمئی بزم ترا باہمہ ہنگامہ ناز

نالۂ نیز بآہنگ اثر می بایست

۹ سنجیدہ ایم فتنۂ محشر بقامتش

یك نیز قد فتنہ طرازش بلند بود

۱۰ جدازدوست شب ماهتابه را چکنم
که کار عارض او از قمر نمی آید
۱۱ آه جان سوز که در سینه ام آرام گرفت
این همان است که از گنبد دوار گذشت
۱۲ داد ازین پیری بے صرفه که ناخوانده رسید
آه ازان عهد جوانی که بناچار گذشت

سچ تو یہ ہے کہ فارسی شاعری کی افتاد ہی کچھ ایسی ہوئی ہے کہ شعرا مجازی رنگ میں ہمیشہ اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے رہے ہیں، چنانچہ سعدی اور حافظ جیسے بزرگ بھی اس حمام میں عریاں نظر آتے ہیں۔ تابہ نظیری و عرفی چه رسد! زبان اور محاورات کے چٹخاروں، ملکی اور تمدنی اثرات ،اور سوسائٹی کے عامیانہ جذبات و خیالات کے ماتحت فارسی شاعری زیادہ تر اسی رنگ میں رنگی گئی، اگرچہ بعض متقدمین (مثل نظامی گنجوی) اور بعض متاخرین (مثل فغانی وغیرہ) نے غزل کی اس پامال روش کو بدلنے کی کوشش بھی کی اور حکمت و اخلاق کی چاشنی بھی غزل میں آمیز کی گئی، مگر اس سے کوئی معتدبہ تغیر نہیں ہؤا، بلکہ اس قسم کا کلام حسن قبول اور شہرت عام حاصل نہیں کرسکا ۔ خود مولانا نے بھی غزل کی اس مبتذل روش کا ذکر اپنے ایک قصیدے اور مثنوی میں کیا ہے(۱)، اور ان کی خواہش بھی تھی کہ وہ شاعری میں نیا طرز سخن ایجاد کریں، مگر ان کے علمی مشاغل اور قومی مصروفیتوں نے اس کا موقع نہیں دیا، اور بالآخر دیگر شعرا کی طرح وہ بھی فارسی کے اس رنگ تغزل سے مستثنیٰ نہ رہ سکے، تاہم اس طرز سخن کے ان کی ثقاہت اور علم و فضل کے رتبے سے فروتر ہونے کا ان کو احساس تھا ۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں اپنی غزلیات کا مجموعہ ''دستۂ گل'' چھپنے کو دیا، اس وقت مسٹر مہدی حسن کو لکھتے ہیں :

''بعض غزلیں زیادہ شوخ ہوگئیں جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں، لیکن حافظ تو کہتے ہیں
ع ہرگہ که یاد روی تو کردم جوان شدم''(۲)

---

(۱) قصیدہ ۱۸۹۰ء کلیات شبلی ص ۱۶ مثنوی ناتمام ۱۸۸۵ء کلیات ص ۵۱

(۲) مکاتیب ج ۲ ص ۲۱۵

ایک اور خط میں اعتراف کرتے ہیں:

''میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں، اور میں نے ع برعکس نہند نام زنگی کافور، ان کانٹوں کا نام ''دستۂ گل'' رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں، اس لیے ان کا پردے ہی میں رہنا مناسب ہے(۱)''

مولانا خود اس مجموعے کو چھپوانا نہیں چاہتے تھے، مگر ایک دوست کا اصرار اس میں شامل تھا، چنانچہ معذرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هرزۂ چند بهم بافتن و پیش کسان
عرضہ دادن نہ پسندیدۂ عاقل باشد
من هم این کار نمی خواستم از دل اما
چه توان کرد چو فرمودۂ بیدل باشد

مولانا حالی کی خدمت میں ''دستۂ گل'' ہدیۃً بھیجتے ہیں تو وہ جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃالنعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی اور بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں:

دو دل بودن درین رہ سخت تر عیبست سالک را
خجل هستم ز کفر خود که دارد بوئی ایمان هم

شاید لوگ تعجب کریں کہ اس شعر میں وجد کرنے کی کونسی بات ہے۔ مگر اس شعر سے ہر شخص لطف نہیں اٹھا سکتا۔ الاالذی ابتلی بمثل ما ابتلی به القائل''(۲)

ایک خط میں فارسی کے ادب پر اس طرح تنقید کرتے ہیں:

''افسوس کہ فارسی لٹریچر کسی قدر غیر معتدل واقع ہوا ہے،

---

(۱) خطوط شبلی ص ۹۴، (۲) معارف ج ۱ نمبر ۱۰ ص ۶۹
(۳) نامۂ حالی بنام مولانا شبلی مرحوم

اور میں بھی اس کو سنبھال نہیں سکتا۔ بہرحال مضامین
کچھ ہوں لیکن زبان ایران کی ہوگی(۱)''

اسی طرح ایک اور خط میں اسی ''دستۂ گل'' کا ذکر کرتے ہوئے شاعرانہ مبالغے کی نسبت فرماتے ہیں :

''بوئے گل کہیے تو آپ کو بھیج دوں۔ دستۂ گل کی نسبت مہذب ہے۔ شاعری در حقیقت ایک خوردبین ہے جس میں چھوٹی چیزیں بڑی بن کر نظر آتی ہیں۔ اس کو لوگ مبالغہ کہتے ہیں ، لیکن وہ مبالغہ نہیں بلکہ اس خوردبین کا اثر ہے(۲)''۔

غزل کے سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک مولانا نے جو غزلیں کہی ہیں ان کا محرک قوی شہر بمبئی کا قیام ہے۔ مولانا اکثر گرمیوں میں بمبئی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ وہاں کی خوشگوار آب و ہوا، پر لطف اور دلکش نظارے ، دلآویز تفریح گاہیں اور سب سے بڑھ کر وہاں کی رنگین اور دلچسپ صحبتیں ، یہ سب محرکات ایسے تھے کہ جنہوں نے ان کی شاعری کے سمند ناز پر تازیانہ کا کام کیا۔ اور ان کے تغزل کا دور گویا صحیح معنوں میں اسی بلدۂ حسن و موسیقی، اور اسی دیار حسین و رنگین ہی سے شروع ہوتا ہے۔بمبئی جانے سے پیشتر بھی مولانا نے غزلیں کہی ہیں اور ان میں بعض اشعار خوب نکالے ہیں ، لیکن ان میں ہم وہ آمد، زور بیان، حسن تخیل اور شگفتگی جذبات نہیں پاتے جو بمبئی جانے کے بعد ان کے کلام میں پیدا ہوئے ، اس میں شک نہیں کہ دیوان میں جو غزلیں پائی جاتی ہیں ان میں وہ گرما گرمی اور ولولہ انگیزی نہیں ہے جو ان کی ''بمبئیات'' یا دستۂ گل اور بوئے گل میں پائی جاتی ہے۔

حشر ایں گرمئی ہنگامہ کجا داشت مگر
پردہ برداشتہ انداز رخ نابانی چند

بمبئی کے مشغلۂ شعر و سخن کے متعلق خود مولانا کے بیانات نہایت دلچسپ ہیں جن کا ذکر ان کی فارسی شاعری کے سلسلے میں مناسب اور ضروری ہی نہیں ، بلکہ ناگزیر ہے ' اور ایک مستقل عنوان چاہتا ہے۔ یہاں صرف بمبئی کے متعلق مولانا کے ان اشعار میں سے چند نقل کر دیے جاتے ہیں

---

(۱) خطوط شبلی، ص ۳۳
(۲) خطوط شبلی، ص ۱۰۲

جو انھوں نے بمبئی کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں :

۱ - وہاں کی آب و ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں -

زہے جان بخشئی آب و ہوائے بمبئی شبلی
طراز خلخ و نوشاد و فرخا راست پنداری

---

۲ - حسینان بمبئی کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

بیا اینجا که هر سو کاروان در کاروان بینی
بتان آذری را دلبران شام و ایران را

---

۳ - بمبئی پر ایک ۵ شعر کی غزل لکھی ہے جو عام طور پر مشہور ہے ، خصوصاً اس کا یہ شعر :

بده ساقی مئے باقی که در جنت نخواهی یافت
کنار آب چوپاٹی و گلگشت و اپالو را !

---

۴ - ایک شعر میں اپنی شاعری کو بمبئی میں محدود کر دیتے ہیں :

شاعری از من سجو دور از سواد بمبئی
حالیا شبلی شدم رند غزلخوان نیستم

کلام شبلی کی خصوصیات :

۱ - مولانا کی فارسی شاعری کا نمایاں وصف خالص فارسیت ہے - جس کی نسبت خود اُن کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے 'زبان کو اہل زبان کے اصول پر برتا ہے' - ایک شعر میں شعرائے ہند کے ساتھ اپنا مقابلہ کرنے پر افسوس ظاہر کرتے ہیں :

در سخن با خاکیان هند می سنجی مرا
هیچه میدانی که این فن راچه سامان کرده ام

ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :

در حیرتم که پاکئ گفتارش، از کجاست
شبلی مگرز مردم هندوستان نبود

وہ ہندوستان جس کی فارسیت پر ایران کو فخر ہے، جس کی قادر الکلامی شعرائے عجم میں ضرب المثل ہے، جس نے خسرو اور فیضی جیسے باکمال پیدا کیے۔ اس سے اپنے آپ کو اونچا رکھنا اگر جائز ہے تو عجب نہیں یہ بلندی اس قسم کی ہو جس کی نسبت مشہور ہے:

آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا!

بہر حال اس میں شک نہیں کہ روزمرہ کی زبان اور محاورات کا جہاں تک تعلق ہے، مولانا کے کلام میں خالص فارسی زبان کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگرچہ مضامین متعارفہ کے ساتھ اکثر محاورات مخصوص ہیں جو حسب موقع و محل استعمال ہوتے رہتے ہیں، لیکن ادائے مطالب کے لیے مخصوص اسلوب بیان، خاص الفاظ کا انتخاب، اور حسن ترتیب ایک خاص صنعت ہے جس کو برتنا اہل زبان ہی کا کام ہے، یہاں ہم ان کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں فارسی کے محاورات باندھے گئے ہیں:

چالاک و گرم آمد و دامن کشان گذشت
از بسکه دست شوق حریفان دراز بود

دل هنگامه جو خمیازه بر خمیازه می ریزد
بکارش ناسزد فرما نگاه فتنه سامان را

گرچه لعل لب جان بخش تو حاشا زده است
میتوان یافت ز چشم تو که ساغر زدهٔ

صد بار از سحاب گرو برد چشم من
با آنکه درس گریه هنوزش روان نبود

از بسکه خوش محاوره افتاد چشم او
کردیم فهم از و سخن ناشنیده را

جانے به بوسه باخته و سود کرده ایم
در پیش می کشید بهاهم گران نبود

متاعی گرید ست آسان فتد قدری نمی‌دارد
باودل را سپردن خواستم اول بها کردم

۲ - مولانا کے کلام فارسی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اساتذہ مثل حافظ، سعدی، جامی، عرفی، نظیری، ظہوری، غالب وغیرہ کی ردیف قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے، مگر اس بات کی پوری احتیاط کی ہے کہ

ان کے قوافی کو ہاتھ نہیں لگایا، اگر کہیں استعمال کیا ہے تو مضمون کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر حافظ کے پیرو تھے اور اسی روانی اور برجستگی کے ساتھ شعر کہتے تھے جو حافظ کا خاصہ ہے، خود بھی فرماتے ہیں :

گر خداوندی ہوس داری در اقلیم سخن
بندگیٔ حافظ شیراز می بایست کرد

علاوہ ازیں انھوں نے عام شعراء کی طرح بہ ترتیب حروف تہجی ردیف اور غزلیں نہیں لکھیں اور نہ حروف تہجی مثل ث، ذ، ز، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق وغیرہ کی ردیفوں میں لکھا۔ انھوں نے صرف ان ردیفوں کو لیا ہے جن میں وہ بلا تصنع اپنے جذبات و کیفیات کا اظہار کر سکتے تھے اور جن کا تلفظ ذوق سلیم پر بارنہ گذرے، اسی طرح بحریں بھی ایسی اختیار کی ہیں جو مروجہ اور عام پسند ہیں، اور جن میں ایک قسم کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری کو انھوں نے رسمیات کا پابند نہیں بنایا یا تخیل کو تصنع کے پردےمیں نہیں چھپایا۔

۳ ۔ خیال بندی یا نازک خیالی جس کو تخئیل بھی کہتے ہیں، مولانا کے کلام میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ متاخرین شعرائے فارسی مثل غنی، ناصر علی اور بیدل اس میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تخئیل شاعری کا زیور ہے لیکن اس سے بسا اوقات مضمون پیچیدہ ہو کر معانی میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان و محاورات، بندش الفاظ و چستیٔ مضامین پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً دورازکار تخئیل شعر کو کسی مصرف کا نہیں رکھتی۔ مولانا شبلی نے تخئیل سے بہت کم کام لیا ہے جس کے شاذ و نادر نمونے ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مثلاً :

محبت را بود هر شیوه آئینی ز جان بازی
به مژگان اشک خون منصور بردارست پنداری

دیدی سحاب را که ز چشم گرو نه برد
با آنکه داشت از همه اعضا گریستن

خال جا کرده بر آن عارض روشن گوئی
آتش افروخته هندوی فسون خوانی هست

ممکن ہے کہ تخئیل کی اور مثالیں بھی ان کے کلام میں مل جائیں ، لیکن وہ تمام تر اسی کے نہیں ہو رہے ، اور نہ انھیں خیالی بلند پروازی کی عادت ہے ، انھوں نے خواجہ حافظ کی طرح غزل کو غزل کی حد تک محدود رکھ کر با محاورہ اور خالص فارسی زبان میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے - بے تکلف بول چال، بے ساختہ پن، اور رنگین طرز انشا کے ساتھ شعر کہنا ان کا شیوہ تھا - اور بات بھی یہ ہے کہ فطری طور پر جو خیالات ادا کیے جائیں وہ تصنع اور تکلف سے پاک ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ استعارات و تشبیہات بھی دورا زکار نہیں لاتے اورحتی الامکان آس پاس اور نزدیک کی چیزوں سے کام لیتے ہیں -

۴ - فن بلاغت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ شعر میں جو خیال باندھا جائے اس کے لیے کوئی مثال بھی پیش کر دی جائے - مثلاً اگر مصرعہ اولیٰ میں کوئی دعویٰ ہو تو دوسرے مصرعے میں اس کی دلیل مہیا کی جائے، اس کو تمثیل کہتے ہیں - قد ما اور متاخرین دونوں کے ہاں یہ طرز سخن بہت مروج اور مقبول رہا ہے ، خصوصاً متاخرین نے اس کو بکثرت برتا ہے - علامہ شبلی کے ہاں بھی اس تمثیل کے نمونے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں - مثلاً :

فارغ دلی بہ بہرۂ هر کس نمی رسد
ماچیست این که دست زد کیقباد نیست
آمد بہار و روئی زمین لالہ زار گشت
با بود آتشی کہ بہر گوشہ در گرفت
چه عجب گرنگه مست تو افتد برمن
باده بیرون فتد از جام چو سرشار افتاد

۵ - قدما کے ہاں سادگی اور بے تکلفی حسن کلام سمجھی جاتی تھی، مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، فارسی شاعری میں نزاکت خیال اور لطافت بیان کے ہزاروں اسلوب پیدا ہو گئے اور متاخرین نے تو اس کو کمال تک پہنچا دیا - مولانا کے کلام میں بھی مضمون آفرینی اور بلند معانی کے کئی نمونے ملتے ہیں - چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) نگه کاش آن قدر سرمایه کردی از تماشایش
که می آمد بکار ماو دل در روز ہجران ہم

یعنی اگر عاشق کی نگاہیں محبوب کی صورت کو خوب دیکھ دیکھ کر آنکھوں میں بٹھا لیتیں تو وہ آڑے وقت میں کام آنے والی پونجی کی طرح ہجر کے دن عاشق اور اس کے دل دونوں کے کام آتی۔

(۲) پیکر آرائے ازل طلعت زیبای ترا
نقش می بست وهم از ذوق تماشا می کرد

یعنی خالق جب محبوب کی صورت بنا رہا تھا تو خود بھی بڑی دلچسپی سے محو تماشا تھا۔

(۳) ذوق نظر به لذت کاوش نمی رسد
داغم ازین که دل نتوان کرد دیده را

یعنی دل میں جو کاوش ہے وہ نظر میں پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ آنکھ کو دل نہیں بنایا جا سکتا، اس کا افسوس ہے۔

(۴) دل را باین فریب تسلی دہم کہ یار
باما ازاں نہ ساخت کہ زود آشنا نبود

معشوق جلدی سے میل پیدا کرنے والا نہ تھا اس لیے ہم سے نہ نبھ سکی۔ یہ کہہ کر عاشق اپنے دل کو تسلی دیتا ہے۔

(۵) آن قدر محو تماشائے جمالش بودم
که نگه را خبر از لذت دیدار نماند

احساسات کی کثرت در اصل ان کو باطل کر دیتی ہے، عاشق دیدار یار میں اس قدر محو ہو گیا ہے کہ دیدار کی جو لذت تھی اسے بھی اس کی نگہ نے فراموش کر دیا۔

(۶) یا جگر کاوی آن نشتر مژگان کم شد
یا که خود زخم مرا لذت آزار نماند

دل میں درد کی لذت باقی نہیں رہی یا معشوق کی مژگان نے نشتر نوازی چھوڑ دی عاشق اپنی طبیعت میں جب کیفیت نہیں پاتا تو خیال کرتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بات ضرور ہے، مگر اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

(۷) حرف انکار ز خوبان همه از دل نه بود
گہ گہ این کار بآئین حیانیز کنند

معشوقوں کا انکار ہمیشہ دل سے نہیں ہوا کرتا۔ کبھی کبھی تو شرم و حیا کے باعث بھی یہ لوگ انکار کر دیا کرتے ہیں۔

(۸) دو دل بودن درین رہ سخت ترعیبست سالک را
خجل هستم ز کفر خود که دارد بوے ایمان هم

رہر و راہ محبت کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ اس ایک ہی راہ پر بلا کسی تردد اور پس و پیش کے گامزن ہو، کہ اس میں ''دو دلی'' یعنی تذبذب، راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔ اس لیے عاشق ''کافر عشق'' ہونے کے باوجود اپنے کفر سے نادم ہے کہ اس میں ابھی ایمان کا شائبہ باقی ہے۔ نہایت بلند مضمون ہے جس کو موزوں اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے۔

۶ - وقوعہ گوئی جس کو اردو والے معاملہ بندی کہتے ہیں ، اور جو آج ہمارے شعرائے اردو کا سرمایۂ ناز سمجھی جاتی ہے۔ اصل میں مفروضہ واقعات کے بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ شعر میں ایسا تخیل ہو کہ سمجھنے والے یہ سمجھیں کہ کوئی حقیقی واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ شیخ سعدی جو طرز غزل کے موجد ہیں ان کے ہاں خال خال وقوعہ گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن امیر خسرو صحیح معنوں میں اس طرز سخن کے بانی ہیں، چنانچہ اس اقلیم فن کے بادشاہ وہی خیال کیے جاتے ہیں ، ان کے بعد شرف جہاں قزوینی (المتوفی ۹۶۲ھ) جو عہد صفویہ کا نامور شاعر گزرا ہے ، وقوعہ گوئی میں امام مانا گیا اور اس نے اس کو انتہا تک پہنچا دیا۔ مولانا شبلی کے ہاں بھی وقوعہ گوئی کی اکثر مثالیں پائی جاتی ہیں، شاید ہی کوئی غزل ہوگی جس میں دو ایک شعر اس رنگ کے نہ ہوں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) به سویم چون گذر افتاد دوش آن ترك پر فن را
بگفت این خسته جان جائی گرفتار ست پنداری

(۲) ناوك بزد بغیر و مرا بر جگر نشست
قربان شوم خطائے نگه هائے راز را

(۳) شرم از لب تو مهر حیا گرچه بر نداشت
شادم بایں که غمزهٔ پر فن بکار بود

(۴) می بینم این که قیمت دم تا کجا کشد
پرسد زمن که نرخ متاع تو چند بود

(۵) لب تشنهٔ زخم است همان این دل بیتاب
کان ناوك پیشین که زدی بر جگر آمد

(۶) تو یك نگاه ناز زیان کردی و مرا
سرمایهٔ که بود دل مستمند بود

(۷) تماشا داشت آن هنگامه خیزیهای اسیدم
دریغ از زود کاریها که مکتوب تووا کردم

(۸) می گویدم که دل به کسی دادهٔ مگر
مارا به نکته دانیٔ او این گمان نبود

۷۔ مولانا کے کلام میں چند اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن کا مضمون دیگر شعرا کے اشعار سے ملتا جلتا ہے اور جس کو اصطلاح میں توارد کہتے ہیں۔ چونکہ اکثر اساتذہ کا کلام ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ نیز خیالات میں یکسانی ہوتی ہے، اس لیے مضامین لڑ جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ابو طالب کلیم کو بھی کہنا پڑا کہ:

ولی علاج توارد نمی توانم کرد   مگر زبان بسخن گفتن آشنا نکنم

توارد کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شبلی: حدیثی دلکش و افسانه از افسانه‌می‌خیزد
وگر از سرگرفتم قصهٔ زلف پریشان را
—شب آخر آمد و افسانه از افسانه می خیزد

شبلی: غافل بخواب ناز تو خفتی و بوسه ام
کام خود از دهان و لبان تو برگرفت
—تو بخواب ناز بودی ومن از رقیب پنهان
کف پات بوسه دادم زحنا شنیده باشی

شبلی: منبر و محراب درس عشق را شائسته نیست
شرح اسرار نهان بردار می بایست کرد

غالب: آن راز که در سینه نهانست نه وعظ است
بردار توان گفت و به منبر نتوان گفت

شبلی: تو بدین حسن توانگر چه زبان برداری
این دو سه بوسه اگر خود نشماری چه شود

صائب: ای خوبیٔ امید باین دستگاه حسن
یك یك دو بوسه گرنه شماری چه می شود

شبلی : مرا از پیر گردون شکوهٔ نیست
که با من هر چه کرد آن نوجوان کرد
— من از بیگانگان هرگز نتالم
که با من هر چه کرد آن آشنا کرد

شبلی : سرو در گلشن بیك پا ایستاد
بهر تعظیم قد دلجوئے تو

مخفی : سرو در باغ بیك پائے نهاده بنگر
برکاب تو ره دگر بودش پائے دگر

شبلی : ناوك بزد بغیرومرا بر جگر نشست
قربان شوم خطائے نگه هائے راز را

خسرو : ببین نرگس شوخ کز چابکی
کجا می نماید کجا می زنند

اشعار ذیل (سے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اردو اشعار کو پیش نظر (رکھ کر) لکھے گئے ہیں :

شبلی : مرگ و حیات در فراق هر دو بپایهٔ هم اند
بر اثر خزان رود بے رخ تو بهار من

غالب : قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

شبلی : نے نالۂ مستانه ونے گریۂ آهی
امروز بکویت مگر آشفته سرے نیست

غالب : بوی گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

شبلی : شبی وصلی درازی خواهم واز بهر آن خواهم
کهٔ خواهم گفت با او شکوهٔ ایام هجران هم

غالب سیرے دل میں ہے غالب شوق وصل وشکوۂ هجران
خداوہ دن کرےاس سے کہ میں یہ بھی کہوں وہ بھی

شبلی بحیثیت نقاد سخن :

جس طرح تاریخ و سیرۃ اور فلسفہ و کلام ہیں علامہ شبلی نقاد مشہور و معروف تھے ، اسی طرح فن شعر و ادب میں بھی وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد تھے ۔ ایک اول درجے کے شاعر ہونے کے علاوہ اصابت رائے، صحت فکر، سخن فہمی، نکتہ شناسی اور وجدان صحیح کے اعتبار سے وہ اپنے اقران و اماثل میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے ۔ سخندان اور سخن فہم اساتذہ کا فیض صحبت، علوم عقلیہ کی طرف خاص توجہ، ایک زمانے تک قانون کی مشق و مطالعہ، کالج کی ملازمت کے زمانے میں مختلف ارباب علم و ادب سے تبادلۂ خیالات اور علمی نقد و بحث، علمی سیر و سیاحت، ان سب پر مستزاد ان کا وسیع مطالعہ اور فطری مذاق ادب، یہ اسباب تھے جنھوں نے مولانا کو فی‌الواقع ایک بہترین نقاد بنا دیا تھا ۔ اور اسی کی بدولت وہ 'شعرالعجم اور 'موازنۂ انیس و دبیر، جیسی نادرکتابیں لکھ سکے جو ان کا مہتم بالشان اور زندہ جاوید تنقیدی کارنامہ ہے ۔ شعرالعجم میں وہ فارسی شاعری کے ایک زبردست نقاد اور محقق کی حیثیت سے ظاہر ہوئے ہیں ۔ اور ہم کو اس لاجواب اور بیمثل کتاب میں ان کی وسعت معلومات، تحقیق و تدقیق اور نکتہ دانی کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں ۔ ادب فارسی کے محقق عالم اور مورخ پروفیسر براؤن آنجہانی نے جو خود بھی بڑے نقاد سخن تھے علامہ شبلی کی نقادانہ قابلیت کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ اپنی یادگار کتاب تاریخ ادب فارسی کی تیسری اور چوتھی جلدوں میں ان کی اکثر آراء اور تنقیدات کو تسلیم کیا ہے ۔ اور اس کی بہت تعریف کی ہے (۱) ۔

اگرچہ فارسی شعر و سخن کی تنقید کے نمونے شعر العجم میں کافی طور پر موجود ہیں تاہم ان کے علاوہ ان کا طرز انتقاد ان اصلاحات سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے بعض احباب کے کلام پر دی ہیں ۔ چنانچہ مولانا شروانی کی بعض فارسی غزلوں پر مولانا نے جو اصلاحیں دی تھیں وہ خوش قسمتی سے ان کے مکاتیب (۲) میں موجود ہیں، ان کے دیکھنے سے مولانا کے

---

(۱) لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد ۳، ص ۱۰۷، ۱۰۸، جلد ۴، ص ۱۶۴ ۔

(۲) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۲۵، ص ۱۲۸ تا ص ۱۳۲

طرز تنقید کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ خود مولانا نے اپنے کلام پر بھی کہیں کہیں تنقید کی ہے جو ان کے خطوط میں موجود ہے، اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں :

''ان میں سب سے دلچسپ وہ تنقید ہے جو اپنے یا اپنے کلام کے متعلق نہایت بے تکلفی اور سچائی سے کر جاتے ہیں، یہ بات کہاں نصیب ہوتی ہے کہ خود مصنف اپنی زبان یا قلم سے اپنے کلام کے متعلق رائے لکھے، اکثر اس بات کو معلوم کرنے کی تمنا رہتی ہے کہ فلاں اعلیٰ مصنف یا شاعر اپنی تصنیف کے متعلق کیا خیال رکھتا تھا، یا وہ اپنی کس کتاب یا نظم کو سب سے بہتر سمجھتا تھا، کہ مصنف اکثر اس معاملے میں بہت شرمیلے ہوتے ہیں، اور بات بھی کچھ ایسی ہی ہے، اس میں خودنمائی اور تعلی ہوتی ہے۔ مولانا شبلی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا ہے، وہ کسی غیرکو نہیں لکھ رہے ہیں، یہ سمجھنا چاہیے کہ اپنے سے باتیں کررہے ہیں(۱)''

چنانچہ اس قسم کے خطوط کے چند اقتباسات ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

(۱) ایک خط میں لکھتے ہیں :
''غزلیں چھپنے کو دیتا ہوں۔ ایک غزل کا شعر مجھ کو مختلف وجوہ سے بہت پسند آیا۔ آپ کو لکھتا ہوں، واقعیت اور اظہار قدرت پر نظر کیجیے، نہاں کردہ ایم ما۔ عیاں کردہ ایم ما طرح ہے :

بیحاصلی نگرا که بایں دوری از رخش
صد جائے بہر بوسه نشان کرده ایم ما(۲)''

---

(۱) مقدمہ خطوط شبلی ص ۲۴،
(۲) مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۱۶۹،

اپنے دیوان ''بوئے گل'' کی نسبت یہ ریمارک کرتے ہیں :
''میرا دوسرا دیوان ''بوئے گل'' نکلا، لیکن بالکل پھیکا ہے، سب محسوس کرتے ہیں اب وہ سامان کہاں(۱)؟''

''بوئے گل کی نسبت تمام اہل نظر کی رائے ہے 'کہ دستۂ گل' اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔ واقعی دونوں کی شان نزول اس قدر مختلف ہے جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔۔۔۔۔لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں، وہ 'بوئے گل' کو حال بتاتے ہیں اور 'دستۂ گل' کو قال ع ببیں تفاوت رہ الخ(۲)''

۱۸۸۳ء میں مولانا نے ایک واسوخت فارسی لکھا تھا اس کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :

''ان دنوں میں نے ایک واسوخت لکھا ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر اس کو لکھ سکا ہوں، واقعی نہایت پر درد ہے''(۳)

''دستۂ گل'' کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوست کو لکھتے ہیں:
''زیادہ شوخ اور آزاد اشعار قلم سے نکل گئے ہیں''
اس کی نسبت مولانا عبدالحق فرماتے ہیں :
''یہ اپنے کلام کی کیا فارسی شاعری کی تنقید ہے''(۴)

اس سلسلے میں اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ ہندوستان میں ہمیں جہاں تک معلوم ہے، آزاد بلگرامی، اور آزاد دہلوی کے بعد اگر کوئی نقاد سخن گزرا ہے تو وہ مولانا شبلی تھے اور اس میں ان کا درجہ اپنے دیگر معاصرین سے بہت بلند تھا۔

---

(۱) مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۲۶۳،
(۲) مکاتیب ج ۲ ص ۲۲۱،
(۳) مکاتیب ج ۲ ص ۶۹
(۴) خطوط شبلی (مقدمہ) ص ۲۵

فارسی شاعری میں مولانا شبلی کا درجہ:

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ غالب فارسی کے خاتم الشعراء تھے، اور وہ خود بھی عرفی اور طالب کی کرسی نشینی کا فخر اپنی ذات سے منسوب کرنے میں انکساری نہ فرماتے تھے۔ لیکن غالب کے بعد بھی کچھ لوگ ان شاعروں کے نام لیوا گذرے ہیں جن میں ایک مولانا شبلی بھی تھے، ناظم ہروی نے عنصری سے لے کر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سربر آوردہ ہوا ہے اس کا ذکر اس نظم میں کیا ہے:

شنیدم کہ در دورگاہ سخن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی — بفردوسی آمد کلاہ سہی
چو فردوسی آورد سر از کفن — بہ خاقانی آمد بساط سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید — سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فروشد زکار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بجامی رسید — ز جامی سخن را تمامی رسید

مرزا غالب کا زمانہ آیا تو انہوں نے جامی کے بعد اپنے تک سلسلہ ملادیا:

زجامی بعرفی و طالب رسید — زعرفی وطالب بہ غالب رسید

اسی طرح غالب کے بعد سے لے کر ہمارے زمانے تک فارسی کے جو شیوا بیان شاعر گزرے ہیں ان میں خواجہ عزیز لکھنوی، مولانا شبلی، شیخ غلام قادر گرامی اور علامہ اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں، چنانچہ ہمارے ایک سخنور اور سخن فہم دوست سید ابراہیم صاحب سحب، ساکن بمبئی نے اس نظم پر اس طرح اضافہ فرمایا ہے:

چو غالب رہا شد ز بند ملال — خدیو سخن شد عزیز از کمال
سخن یافت چون از عزیز انصرام — سلك گشت شبلی بملك کلام
چو شبلی بشد سوے دارالسلام — رسید از گرامی سخن را نظام
گرامی چو زین لابقا بست رخت — سخن بہر اقبال آراست تخت

بلاشبہ اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں ہم اقبال کے سوا کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہیں جو فارسی ادب و شاعری کا صحیح اور پاکیزہ مذاق رکھنے کے ساتھ ہی اعلی درجے کا شاعر بھی ہو اور فارسی زباندانی پر مجتہدانہ عبور رکھتا ہو۔ لہذا یہ کہنا قبل از وقت نہ ہوگا کہ اقبال پر فارسی شاعری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس لحاظ سے ان کو اس سلسلے کی آخری کڑی سمجھنا چاہیے۔

شبلی کے رتبۂ شاعری کا اعتراف ان کے سخن شناس معاصرین کی جانب سے کافی ثبوت ہے ان کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے کا۔ چنانچہ ذیل میں ہم ان کی آراء کو نقل کرتے ہیں :

۱ - خواجہ عزیز لکھنؤی جو فارسی کے شاعر غرا تھے اور مولانا کو ان کی خدمت میں عزیزانہ نیاز حاصل تھا، مولانا کی اس غزل کی نسبت جو علی حزیں کے تتبع میں ۱۸۸۴ء میں چکنم کی ردیف میں لکھی تھی، فرماتے ہیں کہ ''یہ اہل زبان کا کلام ہے'' اسی طرح نیر دہلوی نے تو اس کی بہت تعریف کی اور یہاں تک لکھا کہ ''سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے''۔

۲ - مولانا حالی جو شاعر ہونے کے علاوہ نقاد سخن بھی تھے، مولانا کے فارسی کلام کا سخن شناسانہ اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ شبلی دستۂ گل ہدیۃ بھیجتے ہیں تو حالی جواب میں لکھتے ہیں :

> ''غزلیں کاہےکو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔۔۔۔۔میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم و نثر جو کچھ ہے اس کو بھی چھپوا کر شایع کر دوں مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظر سے گر گئیں ولیس فی ذالك شائبة من التصنع''(۱)

۳ - حضرت اکبر الہ آبادی مولانا کے احباب اور ان کی شاعری کے

---

(۱) رسالہ معارف نمبر ۱۰ جلد ۱ ص ۳۹

قدردانوں میں سے تھے۔ جیسا کہ مولانا کے بعض خطوط (۱) سے پایا جاتا ہے کہ وہ اپنا کلام ان کو بھیجتے تھے اور وہ اس کی داد دیتے تھے، حضرت اکبر نے اپنے ظریفانہ انداز بیان میں مولانا شبلی کی اس طرح تعریف کی ہے:

واہ کیا کہنا آپ کا شبلی　　شعر میں آبروے غالب لی

میرے خیال میں مولانا کی تعریف بحیثیت شاعر اس سے بہتر نہیں ہوسکتی کہ ان کو فارسی شاعری میں غالب کا ہم پلہ قرار دیا جائے۔

۴۔ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی جو خود بھی فارسی کے ایک اچھے شاعر ہیں مولانا کی فارسی شاعری کے متعلق بلند رائے رکھتے ہیں،

۵۔ مولانا حسرت موہانی اردو کے نامور شاعر اور سخن فہم، مولانا شبلی کے درجۂ شاعری کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:

''سخن فہمی اور سخن سنجی دونوں کے لحاظ سے علامہ شبلی کی ذات بلا مبالغہ بیمثل و بے نظیر تھی۔ لاریب اس وقت ہندوستان کا کوئی شاعر، شاعری کا صحیح مذاق رکھنے کے اعتبار سے علامہ شبلی سے برتر بلکہ ان کے برابر ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کرسکتا۔

''پختگئی کلام، خوبیٔ مضامین اور صدق محاورہ کے جیسے پسندیدہ نمونے 'دستہ' گل' اور 'بوئے گل' کی غزلوں میں موجود ہیں، اس کی مثال متاخرین میں مرزا غالب مرحوم کے سوا کسی شاعر کے کلام میں مشکل سے ملے گی، مرزا غالب کے مانند علامہ شبلی کے کلام میں بھی ہندوستانیت کا مطلق اثر نہیں پایا جاتا'' (۲)

۶۔ اردو کے نامور ادیب مہدی حسن مرحوم جو دور جدید کے ایک بہترین انشا پرداز ہونے کے علاوہ فارسی سخن فہمی کا صحیح مذاق رکھتے تھے اور مولانا کے ہوا خواہوں میں تھے، ان کی فارسی شاعری پر اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''جس طرح فارسی کے صحیح ادبی مذاق کا بہت بڑا حصہ آزاد کو ملا تھا، شبلی پر مع شئی زائد اس کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ میں دیوان شبلی

---

(۱) دیکھو مکاتیب ج ۱ ص ۴۵، ج ۲ ص ۲۱۱،

(۲) تذکرۃ الشعراء ۱۹۱۵ء، اردوے معلیٰ ۱۹۰۹ء

کو استشہاداً پیش کرنا چاہتا ہوں۔ شستہ، رفتہ کلام کی برجستگی اپنا مرتبہ آپ بتائےگی، صاف معلوم ہوتا ہے کہ سچے جذبات میں ڈوبا ہوا شاعر خالص اہل زبان ہے جس کو ہند کی ہوا تک نہیں لگی، اساتذہ کے ہزاروں اشعار کا نوک زبان اور روزمرہ محاورات کا ناخنوں میں ہونا اضافی امور ہیں جن کو شبلی کی بلند پایگی کے ثبوت میں پیش کرنا ایک مبتدیانہ فعل ہوگا''(۱)

سخندان اور سخن فہم معاصرین کی وقیع آراء کے ساتھ ہی ہم ان اشعار کو بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں خود مولانا نے اپنا مقابلہ دیگر ایرانی شعراء کے ساتھ کیا ہے! مثلاً ایک جگہ وہ اپنے آپ کو صائب اصفہانی کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں:

ہمان کرد از سخن در ہند شبلی　　　که صائب در سواد اصفہان کرد

ایک اور شعر میں ملک قمی اور صفاہانی سے اپنے تئیں تشبیہ دیتے ہیں :

روشنم شد ز نوا سنجی شبلی امروز　　　ہندرا نیزقمی ہست وصفاہانی ہست

مرزا غالب نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں شیوا بیانی میں شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے، اسی طرح مولانا بھی اپنی فارسی شاعری پر داد طلب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

شبلیا کیست کزوداد سخن میخواہی　　　گرنظیری نہ بود شیخ حزین می باید

مرزا غالب ملک کی ناقدر شناسی کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

غالب سوختہ جان راچہ بگفتار آری　　　بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

اسی قسم کی شکایت مولانا نے بھی کی ہے :

سخن سرائی شبلی بہیچ می ارزد　　　بکشورے کہ سخن ازقبول وطغراہست

اپنی کہنہ استادی پر اس طرح ناز کرتے ہیں :

بآب و رنگ نظم خویشتن ناز و چنان شبلی
کہ در اقلیم معنی کہنہ استادست پنداری

اگرچہ یہ اشعار فخریہ ہیں اور سنجیدگی کے ساتھ ان سے استناد نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ان سے اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ خود مولانا اپنی شاعری کی نسبت کیا رائے رکھتے تھے، وہ فارسی کے سخن سنج اور سخن شناس نقاد تھے اس لیے ان کی رائے اپنے متعلق ''تحسین ناشناس'' اور ''سکوت سخن شناس'' سے تو بہرحال بہتر ہی سمجھنی چاہیے۔

---

(۱) افادات مہدی ص ۱۲۳ طبع اول .

حیات نظامی گنجوی

سلجوقیوں کا عہد سلطنت اسلامی تاریخ میں ایک شاندار اور ممتاز درجہ رکھتا ہے(۱) اس خاندان کے اوج شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے ، اور یہی دور فارسی شاعری کا معراج شباب ہے - خصوصاً سلطان سنجر کے عہد فرخ مہد میں لٹریچر اور سائنس کو جو ترقی حاصل ہوئی اس کی نظیر کسی دوسرے کے عہد سلطنت قبل یا بعد میں نہیں پائی جاتی، جبکہ ایران میں عربی کی نہایت اور اہم ضروری تصانیف مہیا کی جا رہی تھیں ، سنجر کے عہد میں فارسی مصنفین نظم و نثر کی تعداد روز افزوں تھی - اسی عہد زریں میں فارسی کے بے مثل اور زبردست شاعر حضرت نظامی گنجوی پیدا ہوئے -

نام و نسب و ولادت :

الیاس نام، ابو محمد کنیت، اور نظام الدین ان کا لقب تھا، جس پر انہوں نے اپنا تخلص نظامی اختیار کیا - ان کے باپ کا نام یوسف زکی سوید تھا (۲) .

---

(۱) - محمڈن ڈائی نیسٹیز از اسٹینلے لین پول ص ۱۴۹ .

۲ - ان کے نام میں تذکرہ نویسوں کا بہت کچھ اختلاف ہے:

۱ - دولت شاہ (تذکرہ ص ۱۲۸ مطبوعہ یورپ) : 'شیخ نظامئی هو ابو محمد یوسف ابن موید، -

۲ - حاجی خلیفہ (کشف الظنون جزء الثانی ص ۳۰۸): 'نظامی و هو الشیخ جمال الدین ابو محمد یوسف بن موید، -

۳ - آذر اصفہانی (آتشکدہ ص ۳۴۲ مطبوعہ بمبئی): 'ابو محمد نظام الدین احمد یوسف، -

(بقیہ اگلے صفحے پر)

اصل وطن ان کا تفرش (اعمال قم سے) ہے - والد ماجد ان کے گنجہ(۱) میں جو آذر بائجان کے معتبر شہروں میں سے ہے آ کر رہے اور وھیں نظامی پیدا ہوے - خود سکندر نامہ بحری میں فرماتے ھیں :

'نظامی ز گنجینہ بکشاے گنج
گرفتارئی گنجہ تا چند چند
چو در گرچہ در بحر گنجہ گمم
ولے از قہستان شہر قمم' (۲)

ان کی تاریخ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھی ، لیکن

(گزشتہ سے پیوستہ)

۴ - سر گوراوسلی (تذکرۂ شعراے فارسی ص ۴۲): 'ابو محمد بن یوسف بن موید شیخ نظام الدین' -

۵ - ڈاکٹر ریو (فہرست برٹش میوزیم): 'نظام الدین ابو محمد الیاس بن یوسف' -

۶ - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۷ ص ۵۲۱) : 'نظام‌الدین ابو محمد الیاس بن یوسف' -

۷ - ڈاکٹر ولہم باخر (لٹریری ہسٹری آف پرشیا از پروفیسر براؤن جلد دوم ص ۴۰۱): 'الیاس بن یوسف بن زکی موید'۔ان سب میں مؤخر الذکر زیادہ صحیح ہے کیونکہ خود نظامی نے لیلیٰ مجنوں میں اپنے نام کی تشریح کر دی ہے :

'در خط نظامی ار نہی گام
بینی عدد ہزار و یک نام
والیاس کالف بری زتامش
هم با نود و نہ است نامش
گر شد چو رم به نسبت جد
یوسف پسر زکی موید'

(۱) - روس کا ایک قصبہ ہے، اور Elizabethpole کہلاتا ہے -

(۲) - آغا احمد علی(ہفت آسمان ص ۶۲) لکھتے ھیں کہ جتنے نسخے سکندر نامہ بحری کے میری نظر سے گزرے کسی میں میں نے یہ شعر نہیں پایا -

یہ صحیح ہے کہ نظامی نے ۵۹۹ھ مطابق ۱۲۰۲-۰۳ء میں وفات پائی۔(۱) اور چونکہ انھوں نے ساڑھے تریسٹھ برس کی عمر پائی اس لیے سال ولادت ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰-۴۱ء سمجھنا چاہیے۔(۲)

اعزہ و اولاد:

ایام طفولیت ہی میں سایۂ پدری سر سے اٹھ گیا، ساتھ ہی ان کی والدہ نے بھی جو کردی نسل کی ایک رئیسہ تھیں اپنے شوہر کی پیروی کی۔ نظامی کی تعلیم و تربیت کا بار ان کے ماموں خواجہ عمر کے سر پڑا، لیکن اس نے ان کی چنداں خبر گیری نہیں کی۔ چنانچہ ان واقعات کی نسبت خود لیلیٰ مجنوں میں فرماتے ہیں:

باقی پدرم کہ ماند زادم
تا خون پدر خورم ز عالم
گر مادر من رئیسۂ کرد
مادر صفتانہ پیش من مرد
کو خواجہ عمر کہ خال من بود
حالی شدنش وبال من بود

---

(۱)۔
۱۔ دولت شاہ (تذکرہ ص ۱۳۱) ۵۷۶ھ۔
۲۔ حاجی خلیفہ (کشف الظنون ص ۲۰۶) ۵۹۶-۹۷ھ۔
۳ تاریخ جہاں آرا۔ ۵۹۷ھ۔ ۴۔ حبیب السیر۔ ۵۱۲ھ۔
۵۔ وان ہیمر (ہسٹری آف پرشین لٹریچر) ۵۷۲ھ
۶۔ وان ارڈمین (شروان ڈینسٹی) ۵۷۲ھ۔
۷۔ سہل (پر یفیس ٹوشا ھناسہ) ۵۷۲ھ۔
۸۔ تقی کاشی اور (۹)۔ ڈاکٹر اسپرنگر ۶۰۶ھ۔
۱۰۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۷ ص ۵۲۱) ۵۹۹ھ۔
ان سب میں مؤخر الذکر صحیح ہے۔

(۲)۔ نظامی نے لیلیٰ مجنوں کے دیباچے میں جو ۵۸۴ھ میں لکھی گئی، لکھا ہے کہ اس وقت ان کی عمر ۴۹ برس کی ہے سکندر نامہ پورا ہوا اس وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ اور چونکہ اس کے چند مہینوں بعد ہی نظامی نے وفات پائی اس لحاظ سے سال وفات ۵۹۹ھ ہوا، تو سال ولادت ۵۳۵ھ ہونا چاہیے۔ (نیز دیکھیے مصنف کا مفصل مضمون 'تاریخ وفات نظامی گنجوی' مشمولہ ھذا۔ مرتب)۔

نظامی کے ایک بھائی قوامی سطرزی بہت بڑے شاعر تھے، انھوں نے ایک نہایت مشہور قصیدہ لکھا ہے۔ اس قصیدےمیں تمام صنائع و بدائع استعمال کیے گئے ہیں۔(۱) یہ ۱۰۱ ابیات کا مرصع قصیدہ جو یورپ میں 'Ornate Eulogy' قصیدۂ مصنوعہ کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب خرابات مصنفہ ضیا پاشا، جلد اول ص ۲۰۰-۱۹۸ پر مرقوم ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے :

اے فلک را ہوائے قدر تو بار
وے ملک راثنائے صدر تو کار (۲)

اس میں صنعت ترصیع کے علاوہ حسن مطلع بھی ہے۔ قوامی کے اشعار کا مجموعہ جو تقریباً ۶۳۶۳ ہے، فی زمانہ عجائب خانہ لندن میں محفوظ ہے۔(۳) '

خود نظامی کی تصانیف مظہر ہیں کہ انھوں نے تین شادیاں کیں۔ اولاد میں ایک لڑکا محمد نامی تھا جو غالباً ۵۷۰ھ مطابق ۷۵-۱۱۷۴ء میں پیدا ہوا ہو گا، کیونکہ جب نظامی نے مثنوی لیلیٰ و مجنوں (۵۸۴ھ) ختم کی اس وقت اس کی عمر ۱۴ برس کی تھی، چنانچہ اس مثنوی میں اپنے فرزند دلبند کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اے چار دہ سالہ قرۃ العین!
بالغ نظر علوم کونین
آں روز کہ ہفت سالہ بودی
چوں گل بچمن حوالہ بودی
و اکنوں کہ بہ چار دہ رسیدی
چوں سرو باوج سرکشیدی

ان کی ایک لڑکی بھی تھی۔ چنانچہ سکندر نامۂ بحری کے خاتمے پر جبکہ انھوں نے اپنی لڑکی اور لڑکے محمد کو ملک نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا لکھتے ہیں:

دو گوہر بر آمد ز دریائے من
فروزندہ از روئے شاں رائے من

---

(۱)۔ تذکرۂ دولت شاہ ص ۱۲۸ مطبوعہ یورپ۔
(۲)۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۷۴۔
(۳)۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۳۰۱۔

یکے عصمت مریمی یافتہ
یکے نور عیسیٰ برو تافتہ

تحصیل علوم :

نظامی نے درسی علوم کی تحصیل کی۔ ان کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام مروجہ علوم پر عبور حاصل کیا، خود بھی دعویٰ کرتے ہیں :

بہر دانشے دفتر آراستہ
بہر نکتہٗ خامہٗ خواستہ
پذیرفتہ ازہر فنے روشنی
جداگانہ از ہر فنے یک فنی

مولانا جامی لکھتے ہیں کہ شیخ نظامی کو علوم ظاھری، اور مصطلحات رسمی سے بہرۂ وافی حاصل تھا، لیکن وہ سب سے دست بردار ہو کر حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

ہر چہ ہست از دقیقہاے نجوم
با یکایک نہفتہاے علوم
خواندم و سر ہر ورق جستم
چوں ترا یافتم ورق شستم
ہمہ را روے در خدا دیدم
واں خدا بر ہمہ ترا دیدم

عام حالات و اخلاق و عادات :

شاعری کا مادہ نظامی میں فطرتاً مودع تھا۔ شاعر ماں کے پیٹ ہی سے شاعر پیدا ہوتا ہے، نیز گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا اس لیے علوم درسی سے فارغ ہوکر شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دن بدن مشق بڑھتی گئی اور ان کے کلام کا شہرہ چاروں طرف پھیلتا گیا، جس نے سلاطین وقت کو اپنی طرف ملتفت کر لیا۔ وہ ان کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ نظامی اپنی کوئی تصنیف ہمارے نام پر معنون کرے۔(۱)

نظامی صوفی مشرب تھے، اورانھیں شیخ اخی فرج زنجانی سے بیعت تھی(۲)۔ عادت و اخلاق کے لحاظ سے ان کا کیرکٹر بالکل صاف و بے لوث ہے۔ وہ نہایت پرہیزگار، اور امور مذھبی میں محتاط تھے، تعصب نام

(۱)۔ نفحات الانس۔
(۲)۔ تذکرۂ دولت شاہ ص ۱۲۸ مطبوعہ یورپ۔

کو نہ تھا۔ سب سے زیادہ قابل تعریف یہ بات ہے کہ وہ دخت رز سے عمر بھر نا آشنا رہے، جو اکثر شعرائے فارس کا غالب عنصر رہ چکی ہے۔ اس کا ذکر وہ خود سکندر نامۂ بری میں قسمیہ کہتے ہیں :

دگر داند ایزد کہ تابودہ ام
بہ مے دامن لب نیالودہ ام
گر از مے شدم ہرگز آلودہ کام
حلال خدا بر نظامی حرام

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شیخ نے خلوت نشینی اختیار کر لی تھی، اور لوگوں سے بالکل اختلاط نہ رکھتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں :

گل رعنا درون غنچہ حزین
ہمچو من گشتہ اعتکاف نشین (۱)

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اتابک قزل ارسلان کو شیخ نظامی سے ملنے کی خواہش ہوئی، اور اپنا آدمی ان کے بلانے کو بھیجا۔ معلوم ہوا کہ شیخ نے گوشہ نشینی اختیار کی ہے، اور صحبت حکام و سلاطین سے محترز ہیں۔ چنانچہ اتابک خود امتحاناً شیخ کے دیکھنے کو گیا۔ انہوں نے از روئے کرامت معلوم کر لیا کہ اتابک میرے امتحان کو آتا ہے، اور مجھے درویش بینوا گوشہ نشین سمجھ کر حقارت سے دیکھتا ہے۔ شیخ نے اپنی کرامت کا ایک شمہ اس کو دکھلا دیا۔ اس نے دیکھا کہ زرو جواہر سے مرصع ایک تخت شاہانہ بچھا ہوا ہے اور شیخ اس تخت پر جلوہ افروز ہیں، ایک لاکھ غلام مع مصاحبوں اور ندیموں کے صف بستہ کھڑے ہیں۔ اتابک نے بکمال عجزو عقیدت مندی شیخ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، اور اس کا اعتقاد شیخ کے بارے میں زیادہ راسخ ہو گیا، اور اس کے بعد سے شیخ کی نظر التفات بھی اس پر رہا کرتی، گہ بگاہ اس سے ملنے جایا کرتے (۲)۔

مولانا جامی لکھتے ہیں:

'شیخ نظامی نے عمر گرانمایہ اول سے آخر تک قناعت و تقویٰ، اور عزلت‌وانزوا میں گزار دی اور ہر گز تمام شاعروں کی طرح غلبۂ

---

(۱) ۔ تذکرۂ دولت شاہ ص ۱۲۸ ۔

(۲) ۔ تذکرۂ دولت شاہ ص ۱۲۹ ۔ آتشکدہ ص ۱۴۲ ۔ تذکرہ مراۃ الخیال ص ۴۲-۴۳ Doles Persian poets. ص ۹۰ ۔

حرص و ہوا سے ارباب دنیا کی ملازمت اختیار نہیں کی، بلکہ سلاطین روزگار ان سے برکت اور فیض حاصل کرتے تھے۔(۱)
چنانچہ خود ہفت پیکر میں فرماتے ہیں :

چون بعہد جوانی از بر تو
بدر کس نرفتم از در تو
ہمہ را بر درم فرستادی
من نمی خواستم تو میدادی
چونکہ بر در گہ تو گشتم پیر
ز انچہ ترسیدنیست دستم گیر

نظامی کی عزلت گزینی کا خاص سبب تقاضائے سن ہے جس کی نسبت وہ سکندر نامہ بری میں کہتے ہیں :

توانم در زہد بر دوختن
بہ بزم آمدن مجلس افروختن
و لیکن درخت من از گوشہ رست
ز جا گر بہ جنبم شود بیخ سست
چلہ چون چہل گشت خلوت ہزار
بہ بزم آمدن دور باشد زکار
ہمان بہ کہ با این چنین باد سخت
برون آورم چون گل از گوشہ رخت
بخود گم شوم خلق را رہنمائے
ہمایون ز کم دیدن آمد ہمائے
سرم پیچد از خفتن و تاختن
ندانم دگر چارۂ ساختن
ملالت گرفت از من ایام را
بہ کنج ارم بردم آرام را
در خانہ را چون سپہر بلند
زدم بر جہان قفل وبر خلق بند

مدح گوئی :

مذکورۂ بالا فیکٹس کے علاوہ نظامی کے حالات بہت کم دریافت ہوئے ہیں، جس کا سبب تذکرہ نویسوں نے ان کی گوشہ نشینی

(۱) نفحات الانس

قرار دیا ہے، لیکن ایک حد تک یہ صحیح نہیں ۔ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ نظامی نے اپنی اواخر زندگی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی اس لیے ان کے مزید حالات و سوانح کا دریافت ہونا کوئی دشوار امر نہ تھا، لیکن نہایت ہی قابل افسوس امر یہ ہے کہ جو تذکرہ نویس خود نظامی کے معاصرین تھے یا ان کے بعد ہوئے انہوں نے نظامی ایسے بلند پایہ شاعر کے ساتھ بالکل اعتنا نہیں کیا، اور محض چند بے سروپا باتوں، اور لفاظی کے سوا اور کچھ نہیں لکھا ۔ ان میں سے ایک محمد عوفی بھی ہے۔(۱)

نظامی کے حالات میں سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر تذکرہ نویس ان کے اس وصف کا مداح ہے کہ وہ بادشاہوں کی بےجا خوشامد اور مدح سرائی سے پاک تھے ۔ (۲) لیکن نظامی کی مثنویات میں جو مدحیات سلاطین کی پائی جاتی ہیں، ان میں اس قدر مبالغہ اور خوشامد پائی جاتی ہے جو عموماً درباری شعرا اور مداحوں کا طریقہ ہے ۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس کے سوا کسی دربار سے تعلق نہیں، اور وہ اس کو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں ۔ بے شبہ انہوں نے مدحیہ قصائد نہیں لکھے، لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں، ملاحظہ ہو :

ولایت ستاں شاہ گیتی پناہ
فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ
ستارہ کہ بر چرخ ساید سرش
زدہ سکۂ عبدہ بر درش
چو تیر از کماں کمیں افگند
سر آسمان بر زمیں افگند
فرنگ و فلسطین و رهبان وروم
پذیرائے فرمان مهرش چوموم (۳)

(۱) ۔ عوفی چھٹی صدی ھجری میں گزرا ہے اور نظامی کا معاصر ہے ۔ اس نے تاریخ لباب الالباب لکھی ہے جس میں ایک حصہ خالص شاعروں کے حالات میں ہے ۔ کتاب مذکور نایاب تھی، پروفیسر براؤن نے اس کی تصحیح کر کے لندن میں طبع کرائی ہے ۔

(۲)۔ آتشکدہ، دولتشاہ، نفحات الانس، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، فارسی شعرا، وغیرہ۔

(۳) ۔ شعر العجم جلد اول ص ۲۹۸ (مصنفہ، علامہ شبلی) ۔

نظامی کی مثنویاں

ویس و رامیں :

آذر اصفہانی لکھتے ہیں کہ 'سب سے پہلے نظامی نے 'ویس و رامین، (۱) کے قصے کو نظم کیا، یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جبکہ ہنوز ان کے کلام میں پختگی کا رنگ پیدا نہ ہوا تھا، ۔(۲) اور آگے چل کر وہ لکھتے ہیں 'لیکن فقیر کے زعم میں یہ جناب شیخ ہی کی تصنیف ہے، بہر حال ان کی دیگر تصانیف پر نظر کرتے ہوئے قصۂ مذکور کو شیخ سے نسبت دینے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ (۳) بعض تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ یہ قصہ نظامی عروضی سمرقندی نے نظم کیا ہے۔ (۴) لیکن عوفی، جامی، امین‌رازی، والہ‌داغستانی، آزاد بلگرامی وغیرہ تذکرہ نویس اس قصے کو فخرالدین اسعد جرجانی کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ پروفیسر براؤن بھی لکھتے ہیں :

'ویس و رامین کو فخرالدین اسعد جرجانی نے نظم کیا ہے۔ یہ ۱۰۴۸ء کی تصنیف ہے جبکہ سلطان طغرل اہل روم پر فتح پا چکا تھا اور طغرل کے وزیر عمید الدین بوالفتح مظفر نیشا پوری کے نام پر معنون کی گئی ہے،۔(۵)

مثنوی 'ویس و رامین، مذکور ایک قلمی مسودے پر سے بتصحیح و ترتیب آغا احمد علی صاحب، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے 'سلسلۂ ببلوتھیکا انڈیکا، (۶) میں ۱۸۶۵ء میں بمقام کلکتہ طبع ہو چکی ہے، (۷) جس کی نسبت آغا صاحب موصوف لکھتے ہیں :

---

(۱) ۔ یہ قصہ اصل میں پہلوی زبان کا ہے جو نظم میں لکھا گیا تھا ۔

(۲) ۔ آتشکدہ ۳۴۲ ۔

(۳) ۔ آتشکدہ ۳۴۱ ۔

(۴) ۔ دولت شاہ ص ۶۰ ۔ مطبوعہ یورپ ۔ کشف الظنون جزء ثانی ص ۶۴۴ مطبوعہ مصر ۔

(۵) ۔ اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ۲۷۴ مطبوعہ یورپ ۔

(۶) ۔ 'ببلو تھیکا انڈیکا سیریز (انگریزی)، ۔

(۷) ۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۲۷۴-۲۷۵ ۔

'فخر الدین اسعد گرگانی، صاحب مثنوی ویس و رامین که نظم کرده است بنام شاه رکن الدین ابو طالب طغرل بیگ محمود سلجوقی ایرانی که سنه جلوس او ۴۲۹ھ سنه وفات ۴۵۵ھ می باشد و معاصر ارسلان خان شاه شام و القائم بامراللہ خلیفه بغداد بوده، ۔ (۱)

بہر حال مثنوی مذکور فخری جرجانی ہی کی تصنیف ہے ۔ اگر یہ صحیح ہے کہ نظامی گنجوی، یا نظامی سمر قندی نے کوئی مثنوی اس نام کی لکھی ہے تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ دیگر تذکرہ نویس اس کا ذکر نہ کرتے ۔ قطع نظر اس کے دولت شاہ اور صاحب آتشکدہ کے پاس کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں جس سے اس بیان کی تصدیق ہو سکے ۔

نظامیرح کی پانچ مثنویاں جو 'خمسہ، یا 'پنج گنج، کے نام سے موسوم اور مشہور انام ہیں، رسم زمانہ کے مطابق فرماں روایان وقت کے نام پر معنون کی گئی ہیں ۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ شیخ کے زمانے میں خمسہ کو جمع نہ کیا تھا، ہر ایک مثنوی جدا جدا تھی، شیخ کی وفات کے بعد ان پانچوں مثنویات کو مرتب کر کے ایک جلد میں جمع کیا اور 'خمسہ، نام رکھا گیا ۔ ڈاکٹر کلارک ولبر فورس لکھتے ہیں کہ غالباً خمسہ کو نظامی کے صاحبزادے نے جمع کیا، اور مرتب کر کے خمسہ نام رکھا ۔ (۲) لیکن خود نظامی کی ایک غزل پر سے جو انھوں نے اپنے فرزند کے ماتم میں لکھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بیٹا خود ان کے حین حیات میں انتقال کر گیا ۔ اور ان کا کلام چونکہ ان کی وفات کے بعد جمع کیا گیا، اس لیے یہ بات قابل وثوق نہیں ہو سکتی ۔ صاحب آتشکدہ نے لکھا ہے کہ تصاریف زمانہ اور عدم ربط کتابت کے سبب سے خمسہ کا خمس بھی صحیح نہیں رہا ۔ بقول دولت شاہ خمسہٴ نظامی کے کل ۲۸,۰۰۰ ابیات ہیں ۔

یہ پانچوں مثنویاں، نظامی نے علی الترتیب، مخزن اسرار، شیرین و خسرو، لیلیٰ و مجنوں، ہفت پیکر، اور سکندر نامہ، لکھیں ۔ چنانچہ سکندر نامہ میں لکھتے ہیں :

سوے مخزن آوردم اول بسیچ
که سستی نه کردم دراں کار هیچ
وزو چرب و شیرین تر انگیختم
به شیرین و خسرو در آمیختم

---

(۱) ۔ ہفت آسماں ص ۱۸ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۔

(۲) ۔ ترجمہٴ انگریزی سکندرنامہ بری (دیباچہ) ص ۱۷ ۔

وزاں جا سراپردہ بیروں زدم
در عشق لیلیٰ و مجنوں زدم
چو از عشق مجنوں بپرداختم
سوے ہفت پیکر فرس تاختم
کنوں بر بساط سخن گستری
زنم کوس اقبال اسکندری

(۱) - مخزن اسرار:

یہ مثنوی بحر سریع میں لکھی گئی ہے - نظامی سے پہلے کسی نے متقدمین میں سے کوئی مثنوی اس وزن پر نہیں لکھی - (۱) ابراہیم تتوی شرح مخزن میں لکھتے ہیں کہ 'مخزن الاسرار' سے پیشتر کوئی کتاب اس بحر میں تصنیف نہیں ہوئی - یہ مثنوی نظامی نے فخرالدین بہرام شاہ والیٔ ارزنجان کی استدعا پر، جس نے ۶۲۲ھ میں مدت مدید کی فرماں روائی کے بعد وفات پائی (۲) تصنیف کی - اور اسی کے نام پر ناسزد کی - چنانچہ بہرام کا نظامی کو بلوانا، اور کتاب لکھنے کی فرمائش کرنا وغیرہ حالات ہاشمی کرمانی (۳) نے اپنی مثنوی 'مظہر اسرار' میں جو اس نے مخزن کے تتبع میں لکھی ہے' ایک حکایت کے پیرائے میں بیان کیے ہیں - 'مخزن اسرار' ۲۴ ربیع الاول ۵۵۲ھ میں اختتام کو پہنچی، جیسا کہ اس کے خاتمے میں خود فرماتے ہیں:

بود حقیقت بشمار درست
بیست و چارم زربیع نخست
از گہ ہجرت شدہ تا این زماں
پانصد و پنجاہ ودو افزون برآں

حاجی خلیفہ نے لکھا ہے:

'مخزن الاسرار نظامی نظمہ لبہرام شاہ واتمہ فی اربع وعشرین من ربیع الاول سنہ (۵۵۹) تسع و خمسین و خمسمائہ - (۴)

علامہ شبلی نے بھی حاجی خنیفہ کے قول کے مطابق اس مثنوی کی تاریخ تصنیف ۵۵۹ھ تحریر فرمائی ہے، لیکن یہ خود نظامی کی تصریح

---

(۱) - ہفت آسمان ص ۵۳ -
(۲) - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۷ ص ۵۲۲ -
(۳) - المتوفی ۹۴۸ھ -
(۴) - کشف الظنون ص ۴۰۸ من جزء الثانی -

کے خلاف ہے۔

اس مثنوی کے صلے میں نظامی کو پانچ ہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر اور بیش قیمت انواع و اقسام کے کپڑے بھیجے ۔ حاجی خلیفہ نے بحوالۂ تاریخ 'جہاں آرا، لکھا ہے، کہ ان کو پانچ شتر راھوار صلے میں بھیجے گئے۔ (۱) آزاد بلگرامی لکھتے ھیں کہ پانچ ہزار دینار سرخ اور ایک قطار شتر قیمتی کپڑوں سے لدی ہوئی، صلے میں عطا کیے گئے۔ (۲)

مثنوی مذکور تصوف اور اخلاق میں 'حدیقۂ سنائی' اور ناصر خسرو کی اخلاقی نظموں، یا مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ اس میں پند و موعظت کے ضمن میں اکثر حکایتیں بر سبیل تمثیل لکھی ھیں جو تربیت اخلاق کے لیے نہایت دلچسپ اور زود اثر ھیں ۔ ھم یہاں اس میں سے ایک حکایت نقل کرتے ھیں، جس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ ایک دانشمند، اور روشن خرد وزیر نے کس طرح ساسانی خاندان کے ایک فرمانروا کو اس کے ظلم اور بیداد پر متنبہ کیا، اس سے اس مثنوی کی طرز کا بھی کچھ اندازہ ھو سکے گا :

'صید کناں مرکب نوشیرواں
دور شد از کوکبۂ خسرواں
مونس خسرو شده دستور و بس
خسرو، و دستور و دگر، هیچ کس
شاه دراں ناحیۂ صیدیاب
دید دهے چوں دل دشمن خراب
تنگ دو مرغ آمده با یکدگر
از دل شاں قافیه شاں تنگ تر
گفت بدستور، چه دم میزنند؟
چیست صفیرے که بهم می زنند؟
گفت وزیر، اے ملک روز گار!
گویم اگر شه بود آمرزگار
این دو نواتر پئے رامشگریست
خطبۂ از بهر زنا شوهریست

(۱) ۔ کشف الظنون ص ۳۰۸ جزء الثانی ۔
(۲) ۔ خزانہ عامرہ ص ۴۳۰ ۔

دخترش این مرغ بداں مرغ داد
شیر بہا خواهد ازو با مداد
کین ده ویراں بگذاری بما
نیز چنیں چند سپاری بما
واں دگرش گفت کزین در گزر
جور ملک بین و برو غم مخور
گر ملک این است و چنین روزگار
زیں ده ویراں دهمت صد هزار

(۲) **خسرو شیریں :**

یہ مثنوی ابو جعفر اتابک محمد بن ایلدگز (۱) فرماں روائے آذر بائجان کے نام معنون کی گئی، لیکن مثنوی پوری ہوئی تو اس وقت محمد بن ایلدگز وفات پاچکا تھا (۲) اور اس کی جگہ پر اس کا بھائی قزل ارسلان قائم مقام مقرر ہوا تھا۔اس نے خسرو شیریں کو اپنے نام پر معنون کرنے کے لیے نظامی سے استدعا کی۔ چنانچہ اسی کے نام سے نامزد ہوئی۔ اس کے صلے میں قزل ارسلان نے ایک گاؤں جس کا نام حمدونیاں (۳) تھا، اپنی طرف

---

(۱) ۔ اتابک محمد بن ایلدگزخاندان سلجوقیہ کےآخری تاجدار طغرل بن ارسلان کا چچا، اور وزیر تھا ۔ طغرل نے سلطنت کا تمام کاروبار اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا، اس کا بھائی قزل ارسلان بھی کاروبار سلطنت میں برابر کا شریک تھا ۔

(۲) ۔ تیرہ برس حکومت کرنے کے بعد ذی الحجہ ۵۸۱ھ مطابق مارچ ۱۱۸۶ء میں اس نے وفات پائی ۔

(۳) ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس کو الگ الگ 'حمد' و 'نیاں' پڑھا ہے' اور لکھا ہے کہ نظامی کو دوگاؤں صلے میں عطا ہوئے ۔ مگر یہ غلط ہے۔ دولت شاہ اور اس کے تتبع میں آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ نظامی کو چار گاؤں آباد بادشاہ کی طرف سے جاگیرمیں ملے ۔ مگر اس کا ذکر نظامی نے کہیں نہیں کیا، البتہ محمد بن ایلدگز نے دو گاؤں دینے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اس مثنوی کے اختتام سے پیشتر انتقال کر گیا ۔ چنانچہ جب قزل ارسلان نے نظامی سے جاکر پوچھا کہ 'بھائی صاحب نے آپ کی جاگیر میں جو دو گاؤں دیے تھے وہ ملے یا نہیں ، انھوں نے کہا :

بلے شاہ سعید از خاص خویشم — پزیرفت آنچہ فرمودی زپیشم
چو رخت عمر او کشتی رواں کرد — مرا نےجملہ عالم رازیاں کرد

سے جاگیر میں دیا، چنانچہ فرماتے ھیں :

نظر بر حمد و بر اخلاص من کرد ده حمدونیان را خاص من کرد

اتفاق سے جو گاؤں جاگیر میں دیا گیا وہ غیر آباد تھا، چنانچہ، اس کی شکایت ایک حاسد کی زبانی ادا کرتے ھیں :

شنیدم حاسدے زانها که دانی
که دزد کیسه‌بر، باشد نهانی
دهے داده بتو چون کورهٔ‌تنگ
که باشد طول و عرضش نیم فرسنگ
نه دارد دخل و خرج کیسه پرداز
سوادش نیم کار ملک ایجاز
عروسے کا سمان بوسید پایش
دهے ویرانه باشد رونمایش

اس کے جواب میں نظامی کہتے ھیں کہ اگر غیر آباد ھے تو کیا ھوا، بادشاہ کا عدل اس کو آباد کرے گا :

وگر دارد خرابی سوے او راه خراب آباد کن از دولت شاه

معلوم ھوتا ہے کہ جب نظامی 'خسرو شیریں، لکھ رھے تھے، اس وقت سب سے پہلے طغرل (۱) (ثالث) بن ارسلان نے اس کا شہرہ سن کر نظامی سے، اپنے نام پر معنون کرنے کی فرمایش کی تھی ۔(۲) اس کے علاوہ

(۱) ۔ طغرل اپنے باپ ارسلان کی وفات کے بعد ۵۷۱ھ مطابق ۱۱۷۶ء میں سات برس کی چھوٹی عمر میں بزیر نگرانی و سرپرستی اتابک محمد بن ایلدگز تخت نشین ھوا، اور ۵۹۰ھ سلطان علاؤالدین تکش فرماں روائے خوارزم کے ھاتھ سے لڑائی میں قتل ھوا، چنانچہ نظامی کہتے ھیں :

برے ناخورده از باغ جوانی چو ذوالقرنین ز آب زندگانی
شہادت یافت از زخم بد اندیش که باد از آن جہانش زین جہاں بیش

(۲) ۔ چنانچہ خود دیباچہ میں کہتے ھیں :

چو سلطان جہاں شاہ جواں بخت که برخوردار باد از تاج و از تخت
به سلطانی به تاج و تخت پیوست بجاے ارسلاں بر تخت بنشست
من این گنجینه را در میکشادم بناے این عمارت می نہادم
اشارت رنگیے از درگاه معمور بشغل بنده القا کرد منشور
گزیناں تحفهٔ عالی بسازد که عقل از منتشی گردن فرازد

اس مثنوی کے شروع میں سب سے پہلے طغرل کی مدح بھی موجود ہے۔

اس مثنوی کا سال اتمام کہیں مذکور نہیں، لیکن چونکہ یہ مثنوی اتابک محمد بن ایلدگز کی وفات کے بعد، (جو ۵۸۱ھ میں واقع ہوئی) پوری ہوئی اور قزل ارسلان ۵۸۲ھ میں اس کا جانشین مقرر ہوا، اس لحاظ سے اس کی تاریخ اختتام ۵۸۱ھ ہی ہونی چاہیے۔

جس زمانے میں نظامی یہ مثنوی لکھ رہے تھے، ان کے دوست جو مذہبی امور میں نہایت متعصب تھے کے پاس آئے اور نہایت ناراضی کے لہجے میں کہا:

فسون بت پرستاں بفگن از مشت
فسون خوانی مکن بر ژند و زردشت
چرا رسم مغاں را تازہ داری
در توحید زن کا وازہ داری

لیکن جب نظامی نے مثنوی کے چند اشعار پڑھ کر سنائے تو انہوں نے بیساختہ کہا:

مگر شیریں بداں کردی د ھانم
کہ در حلقم شکر گردد زبانم

اگر خوردم زباں را من شکر دار
زباں چوں تو ھمی بادا شکر بار

چنیں سحرے توانی ساز کردن
بتے با کعبہ' انباز کردن!

پروفیسر براؤن لکھتے ھیں:

'مثنوی خسرو شیریں میں نظامی نے طرز سخن، اور واقعات کے لحاظ سے کم سنائی کا، اور زیادہ فردوسی کا تتبع کیا ہے۔ گو اس مثنوی کا موضوع عشقیہ فسانہ ہے۔ خصوصاً حسین شیریں (۱) کے ساتھ ساسانی بادشاہ

---

(۱)۔ بعض شیریں کو مریم، اور ایرین بھی کہتے ھیں، یونانی مورخوں نے اس کو رومن نژاد، اور مذھباً مسیحی بیان کیا ہے، مگر وہ فارسی اور ترکی داستانوں میں بطور شہنشاہ ماؤریس (Maurice) کی دختر کے پیش کی گئی ہے۔

خسرو پرویز (۱) کا تعشق ۔ اور اس کے بد نصیب رقیب فرہاد کی جاں گزا موت کا حسرت ناک واقعہ ۔ ان ذرائع پر سے اخذ کیا گیا ہے جن کو فردوسی نے برتا ہے۔

یہ ان کی تمام مثنویوں میں باستثناء سکندرنامہ بہت بڑی مثنوی ہے جس میں تقریباً سات ہزار ابیات ہیں ۔

(۳) ۔ لیلیٰ مجنوں :

سلاطین شروانیہ کے سلسلے میں جو بہرام چوبیں کی یادگار تھے، منو چہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ آخشستان علم و فضل کی قدر دانی کے لحاظ سے سب میں ممتاز، اور نہایت علم دوست بادشاہ تھا ۔ خاقانی، اور ابوالعلا گنجوی کو اسی کے دربار سے افضل الشعرا،اور ملک الشعرا کا خطاب عنایت ہوا ۔ منوچہر نے نظامی کو ایک خط لکھا، جس میں لیلیٰ مجنوں کی داستان کو نظم کرنے کی استدعا کی گئی تھی ۔ چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں :

در حال رسید قاصد از راہ
آورد مثال حضرت شاہ
بنوشتہ بہ خط خوب خویشم
دہ پانزدہ سطرنغز پیشم
کاے محرم حلقۂ غلامی!
جادو سخن جہاں نظامی
خواہم کہ بیاد عشق مجنوں
گوئی سخنے چو در مکنوں

خط پڑھ کر نظامی کو تردد لا حق ہوا ۔ اس وقت ان کے صاحبزادے محمد جن کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی، باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی اس بات کو زور دیا :

لیلیٰ مجنوں ببایدت گفت
تا گو ہر قیمتی شود جفت

لیکن نظامی نے نہایت افسردہ دلی سے کہا :

گفتم سخن تو ہست بر جاے
چوں آئینہ روے آہنین راے

---

(۱) ۔ یہ ساسانی خاندان کا بادشاہ ۵۹۱ء میں تخت نشین ہوا اور ۶۲۸ء ماہ فروری میں فوت ہوا ۔

لیکن چه کنم هوا دو رنگست
کاندیشه فراخ و سینه تنگ ست

* * * * * * *

نے باغ نه بزم شہریاری
نے رود نه مے نه کامگاری
بر خشکئی ریگ و سختئی کوه
تا چند سخن بود زاندوه؟

داستان کی شہرت میں کلام نہیں، لیکن، اس قصے کی سر زمین خشک ریگزار اور کوہستان ہے، بھلا اس میں کیا اپنا زور طبع دکھا سکوں گا۔ باغ و راغ، چشمه و مرغزار، بزم شاہی وغیرہ جو زینت سخن کے لیے ضروری ہیں اس میں ایک بھی نہیں جو دلچسپی کا سامان ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی (شاعر) نے اس داستان کو ہاتھ نہیں لگایا:

ایں بود کز ابتدائے حالت
کس گرد نگشتش از ملالت

لیکن صاحبزادے نے زیادہ اصرار کیا:

در گفتن قصهٔ چنیں چست
اندیشهٔ نظم را مکن سست
هر جا که بدست عشق خوانے است
ایں قصه برونمک فشانے است
گر چه نمکے تمام دارد
بر سفره کباب خام دارد
چوں سفهٔ خارش تو گردد
پخته بگزارش تو گردد

غرض بادشاہ کے ارشاد کی تعمیل میں نظامی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا۔ اور چار مہینے کے اندر ہی اندر سلخ رجب ۵۸۴ھ میں انجام کو پہنچایا۔ کل چار ہزار ابیات ہیں:

من گفتم و دل جواب می داد
خاریدم و چشمه آب می داد
این چار هزار بیت و اکثر
گفتم به چهار ماه کمتر

گر شغل دگر حرام بودے
در چاردہ شب تمام بودے

کا راستہ شدبہ بہترین حال
در سلخ رجب بثے و فے دال (۱)

تاریخ عیاں کہ داشت باخود
ہشتاد و چہار بود و پانصد

اس مثنوی کے ہیرو، (قیس عامری)(۲) مجنوں، اور ہیروئین لیلیٰ کوئی شاہی اقتدار یا امارت والے نہ تھے بلکہ ایک معمولی اعرابی تھے جن کی باہمی عشق و محبت کی داستان مشرق کے تمام اطراف واکناف عالم میں گوش زد خاص و عام ہو کر ضرب المثل کے درجے تک پہونچ گئی ہے۔

یہ عشقیہ فسانہ شکسپئیر کے ڈراما رومیو جولیٹ سے بہت کچھ مشابہت رکھتا ہے۔ بلکہ اہل یورپ اس کو مشرق کا رومیو جولیٹ مانتے ہیں۔ جس طرح فرانس و اٹلی کی مشہور عشقیہ داستانیں 'ایبلا روڈ' و 'ایبلائس' اور 'پٹرک ولاؤرا' ہیں اسی طرح عرب و عجم کی یہ صاف، پر اثر اور دلکش عشقیہ داستان ہے۔

---

(۱)۔(ث=۵۰۰+ف=۸۰+د=۴)=۵۸۴۔(قن)

(۲)۔قیس عامری المتوفی ۷۰ھ مطابق ۶۸۹ء عربی میں اس کا ایک دیوان موجود ہے جو زیادہ تر عشقیہ اشعار پر مشتمل ہے (لٹریری ہسٹری آف دی عربز از نکلسن)۔

طامس ولیم‌بیل اورنٹیل بایو گریفکل ڈکشنری ص ۳۷ میں لکھتے ہیں کہ امرأ القیس (عرب کا مشہور شاعر) وہی شخص ہے جو لیلیٰ کا عاشق تھا اور جس کو عوام مجنوں کہتے ہیں۔ اس کا زمانہ ۳۰۱ھ بتلایا ہے۔ لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہے اول تو دونوں کے زمانے میں اختلاف ہے دوسرے نام میں بھی بڑا فرق ہے۔ غالباً انہوں نے یہ سمجھ کر دونوں کو ایک لکھدیا ہے کہ دونوں کا دیوان عربی میں موجود اور دونوں کے نام میں لفظ قیس ہے۔

(۴) - هفت پیکر:

یہ مثنوی سلطان علاؤالدین اسنتری کی فرمایش سے لکھی گئی، (۱) اور ۱۴ رمضان ۵۹۳ھ کو انجام پذیر ہوئی:

از پس پانصد و نود سہ قران
گفتم این نامہ‌راچو ناموران
روز بد چار دہ ز ماہ صیام
چار ساعت ز روز رفتہ تمام

اس مثنوی کا دوسرا نام 'بہرام نامہ' ہے۔ اس لیے کہ یہ ساسانی خاندان کے بادشاہ بہرام گور کے متعلق ہے۔ اس میں بہت سی داستانیں ہیں جو اس بادشاہ کی شجاعت، جوانمردی، اور شکار بازی کے متعلق ہیں جن میں سے اکثر سچی، پرانی حکایات و روایات یا کم از کم تاریخی واقعات پر مبنی ہیں جن کو طبری ایسے مشہور مورخ نے اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ اور جو خود نظامی کا مآخذ ہے۔(۲) بہ نسبت ہفت پیکر کے 'بہرام نامہ' اس مثنوی کی ماہبت اور موضوع کا بخوبی بتا دیتا ہے۔

ہفت پیکر کی ساتوں داستانوں میں نہایت دلچسپ اور پر لطف چوتھی حکایت روس کی شہزادی کی ہے۔ اس کا بعینہ نمونہ جوزی کی 'ٹورانڈوٹ' ہے جس کو بعد میں اسخلر صاحب نے جرمن اسٹیج کے لیے ملتقط کیا تھا۔(۳)

---

(۱) - ڈاکٹر باخر نے ملک نصرۃ الدین کا نام لکھا ہے۔ اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں نورالدین ارسلان بن عزالدین مسعود فرماں روائے موصل مرقوم ہے۔ لیکن اس مثنوی میں سوائے علاؤالدین کے کسی کا نام مذکور نہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی کے نام پر لکھی گئی۔

(۲) - چنانچہ ہفت پیکر کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

باز جستم زنامہاے نہان
کہ پراگندہ بود گرد جہان
زان سخنہا کہ تازی است و دری
در سواد بخاری و طبری

(۳) - انسائکلو پیڈیا برٹانیکا ص ۵۲۲ جلد ۱۷ بہرام گور ۴۲۰ء میں اپنے باپ یزد گرد کی وفات پر تخت نشین ہوا اور سن ۴۳۸ء میں فوت ہوا۔

(۵) ۔ سکندر نامہ:

نظامی کی آخری تصنیف جس میں انہوں نے فردوسی کا مقابلہ کیا ہے، سکندر نامہ ہے ۔ شاہ نامہ کے بعد کوئی رزمیہ داستان ایسی نہیں تھی 'جو قوم کے شجاعانہ جذبات کو زندہ رکھتی ۔ اس لیے دوسرے شاہ نامہ کی ضرورت ہوئی، چنانچہ وہ سکندرنامہ کے قالب میں نمودار ہوا ۔ نظامی نے سکندر ایسے مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جس کو یورپ اور ایشیا دونوں مانتے تھے ۔ لیکن افسوس یہ ہے انہوں نے ذوالقرنین کو سکندر بنا دیا جو صریحاً قرآن مجید کے خلاف ہے ۔

قزل ارسلان کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا ابو بکر نصرۃ الدین بن محمد تخت نشین ہوا ۔ چونکہ نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا اس لیے یہ مثنوی انہوں نے اپنی خواہش سے لکھ کر نصرۃ الدین کے نام پر معنون کی' (۱) لیکن مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اور مثنویوں کی طرح یہ بھی بادشاہ کی فرمایش سے لکھی گئی :

چو فرمان چنین آمد از شہر یار
که برنام من نقشبند ایں نگار

بگفتار شه مغز را تر کنم
بگفت کسان مغز در سر کنم

فرستم عروسے بآں رزمگاہ
کزو چشم روشن شود بزم شاہ

سکندر نامہ کے دو حصے ہیں: (۲) ۱- شرف نامہ ۲- اقبال نامہ (یا) خردنامہ ۔ ہندوستان میں وہ سکندرنامہ بری و بحری کے نام سے موسوم ہیں۔ سکندرنامہ بری میں کشورستانی، اور سکندرنامہ بحری میں پیغمبری کے واقعات

---

(۱) ۔ شعر العجم حصہ اول ۔

(۲) ۔ خان آرزو نے اپنی شرح سکندرنامہ میں لکھا ہے : 'نظامی کے اس شعر:

سه در ساختم هر درے کان گنج
جداگانه بر هر درے برده رنج

سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندرنامہ تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، ایک بری دوسرا بحری اور تیسرے کا پتہ نہیں ۔ لیکن ظن غالب ہے کہ وہ زیادہ مروج نہیں رہا جس میں شاید سکندر کی پیغمبری کا حال بیان کیا ہو گا، ۔

اور فلسفیانہ بحثیں ہیں ۔ ان میں سے حصہ' اول ۴ محرم ۵۹۷ھ مطابق اکتوبر ۱۲۰۰ء میں اور حصہ' دوم ۵۹۹ھ میں اتمام کو پہونچا :

نوشتم من این نامہ رادر جہاں
که تا دور آخر بود جاوداں
بتاریخ پانصد، نود هفت سال
چہارم محرم بوقت زوال
* * *
به پایاں شد این داستان دری
بفیروز فالی و نیک اختری
ز هجرت چناں بردهم یادگار
نود نه گزشته از پانصد شمار

اس کے صلے میں مقررہ رقم (ایک هزار نقد) کے علاوہ سواری کا گھوڑا، اور بیش قیمت خلعت بادشاہ کی طرف سے عطا هوئی۔(۱)

سکندر نامہ کا تاریخی مواد :

نظامی نے سکندرنامہ میں جو کچھ شاعرانہ رنگ آمیزیاں کی هیں اس سے اصل واقعات کی صحت میں بہت کچھ نقص پیدا هو گیا هے ، اور اس لیے تاریخی حیثیت سے هماری نظر میں سکندر نامہ کی کوئی وقعت نہیں رهتی ۔ خود نظامی بھی اس کے قائل هیں :

اگر راست خواهی سخنهاے راست
نشاید در آرایش نظم خواست
گر آرایش نظم زو کم کنم
به کم مایه بیتش فراهم کنم
همه کردهٔ شاه گیتی خرام
دریں یک ورق کاغذ آرم تمام

یعنی اگر سچ پوچھو تو نظم کی آرائش میں سچی باتیں نہیں آ سکتیں ، اس لیے کہ نظم کی بنیاد مبالغہ، اور دورازکار واقعات پر مبنی هے ، تو اگر میں آرائش نظم کو چھوڑ کر صرف اهم اور ضروری باتیں لکھنے پر اکتفا کروں تو سکندر کے تمام حالات اس کے ایک ورق میں ختم هو جائیں ۔

---

۱ ۔ سکندر نامہ بحری کے خاتمے میں یہ سب مفصلاً مرقوم هے ۔

سکندر نامہ کے تاریخی مآخذ کی نسبت خود نظامی کا بیان ہے کہ انھوں نے سکندر کے تمام واقعات کسی تاریخ میں یکجا لکھے ہوئے نہ پائے ۔ تمام تواریخ قدیم و جدید جن میں سے اکثر عبرانی، یونانی، اور پہلوی زبانوں میں تھیں انھوں نے ان سب کو یکجا کیا، اور تحقیق و تدقیق سے اس کے صحیح حالات دریافت کر کے ان سے اپنی نظم کو آراستہ کیا :

چو می کردم ایں داستاں را بسیچ
سخن راست‌رو بود و رہ پیچ پیچ
اثرہاے آں شاہ آفاق گرد
ندیدم نگاریدہ در یک نورد
سخنہا کہ چوں گنج آگندہ بود
بہر نسختے در پرا گندہ بود
ز ہر نسخہ برداشتم مایہا
برو بستم از نظم پیرایہا
زیادت ز تاریخہای نوی
یہودی، و نصرانی و پہلوی

لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کے واقعات شاہ نامہ سے اخذ کیے گئے ہیں ۔ اور غالباً نظامی نے ان واقعات کو، جن کو فردوسی نے چھوڑ دیا ہے ، مزید اضافہ کر کے سکندرنامہ کی ترتیب کی ہے ۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے :

سخن گوئی پیشینہ داناے طوس
کہ آراست روے سخن چوں عروس
وزاں نامہ کاں گوہر سفتہ راند
بسے گفتنیہا کہ ناگفتہ ماند
دگر ہر چہ گفتندے از باستاں
بگفتن دراز آمدے داستاں
نہ گفت آنچہ رغبت پذیرش نہ بود
ہماں گفت کزوے گزیرش نہ بود
دگر از پے دوستاں زلہ کرد
کہ حلوا بہ تنہا نبایست خورد

نظامی که در رشته گوهر کشید
قلم دید ها را قلم در کشید
بنا سفته درے که در گنج یافت
ترازوے خود را سخن سنج یافت
شرف نامه را فرخ آوازه کرد
حدیث کہن را بدو تازه کرد

اگرچہ ظاہر میں سکندر نامہ، شاہ نامہ کا فوٹو نظر آتا ہے۔ مگر دونوں کے انداز کلام میں بہت فرق ہے ۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ فردوسی کی بے تکلفی اور سادہ گوئی نے تشبیہوں اور استعاروں میں جو چیزیں آس پاس نظر آتی تھیں وہ سب خرچ کر دیں، نظامی نے جب انہیں مستعمل دیکھا تو ان پر نقاشی کر کے کام میں لائے۔ فردوسی کے کلام میں استعارہ اس قدر کم تھا کہ گویا نہ تھا، نظامی نے تشبیہ کو استعارہ اور ،استعارہ در استعارہ کر دیا ۔ اس سے مضمون رنگین ہوا مگر بجاے صفائی کے باریکی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی، اور ساتھ ہی اس کی اصلیت گم ہو گئی ۔(۱)

صاحب آتشکدہ کی راے ہے کہ نظامی کے بعد ایسی مثنویاں کسی نے نہیں لکھیں ۔ ان مثنویوں کی قبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین میں سے اکثر شعرا نے ان مثنویوں کی طرز پر مثنویاں لکھنے کو اپنا فخر سمجھا۔ خمسۂ نظامی کے تتبع میں مثنویاں لکھنے والوں کی تعداد اتنی ہے کہ اگر ان سب کو جمع کیا جاے تو ایک اچھی خاصی فہرست تیار ہو سکتی ہے ۔ یہاں ہم غیر معروف شاعروں کو چھوڑ کر صرف چند شعرا کے نام مع ان کی مثنویوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں :

نظامی : مخزن اسرار۔ خسرو شیریں ۔ لیلیٰ و مجنوں ۔ هفت پیکر ۔ سکندرنامہ ۔
امیر خسرو : مطلع الانوار۔ شیرین و خسرو۔ لیلیٰ و مجنوں، ہشت بہشت، آئین سکندری ۔

خواجوی کرمانی : روضۃ الانوار۔ گل و نوروز، همای و همایوں۔

جامی : تحفۃالاحرار۔ یوسف و زلیخا ۔ لیلیٰ ومجنوں ۔ سلسلۃالذھب ۔ خردنامۂ اسکندری ۔

ہاتفی : خسروشیریں۔ لیلیٰ و مجنوں۔ هفت منظر۔ تیمورنامہ ۔

---

(۱) ۔ سخندان فارس، مصنفہ شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی ص ۲۸۱ ۔

نوائی: حیرۃ الابرار، فرہاد و شیرین۔ سبعہ سیارہ۔ اسکندر نامہ۔
فیضی: مرکزادوار۔ نل‌دمن۔ سلیمان و بلقیس۔ (ناتمام) ہفت کشور۔ (ناتمام) اکبر نامہ۔ (ناتمام)۔

فارسی کے علاوہ ترکی، چغتائی، اور ہندوستانی زبانوں میں اس کے تتبع میں بہت سی مثنویاں لکھی گئی ہیں(۱) جن کے نام بھی آج کوئی نہیں جانتا۔ لیکن آج تک کوئی نظامی کی برابری نہ کر سکا اور 'الفضل للمتقدم، کا سہرا نظامیؔ ہی کے سر رہا۔ مسٹر اربتھنات لکھتے ہیں کہ مولانا جامی کا 'ہفت اورنگ، خمسہ نظامی کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن خود مولانا جامی کی یہ دلی آرزو تھی کہ میں نظامی کا ہم پایہ ہو جاؤں چنانچہ فرماتے ہیں:

اہل دل از فکر چو محفل نہند
بادۂ را از قدح دل نہند
رشحے ازاں بادہ بجامی رساں
رونق نظمش بہ نظامی رساں (۲)

سولانا جامی فرماتے ہیں کہ خمسہؔ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا (۳)۔ لیکن خسرو کی مثنویات کی نسبت عبید یہ‌رائے ظاہر کرتا ہے:

غلط افتاد خسرو را زخامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

خود امیر خسرو بھی لیلیٰ مجنوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں:

می داد چو نظم نامہ را پیچ
باقی نگزاشت بہر ما ہیچ

بقول بعض مصنفین خسرو اور جامی کو نظامی کی ابیات و مضامین میں اکثر جگہ توارد ہوا ہے۔(۴)

---

(۱)۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔
(۲)۔ حیات جامی از مولانا اسلم ص ۷۰۔
(۳)۔ بہارستان جامی ص ۹۴۔
(۴)۔ مطلع العلوم ص ۵۳-۱۵۲۔

نظامی

اے صفت بندہ نوازندگی
از تو خدائی و زما بندگی

خسرو

دو کار است بافرہفرخندگی
خدا وندی ازتو ز ما بندگی

نظامی

خدا وندا در توفیق بکشاے
نظامی را رہ توفیق بنماے
چو ابراہیم بابت عشق می باز
ولے بتخانہ را از خود مپرداز

جامی

الہیٰ غنچہٴ امید بکشاے
گلے از روضہٴ جاوید بنماے
خلیل آسا در ملک یقیں زن
نواے "لااحب الآفلیں" زن

نظامی

چہ خوشتر آں کہ بعد از انتظارے
بامیدے رسد امیدوارے
ز غمزہ تیر و از ابرو کماں ساز
ہمہ باریک بیں و راست انداز
مرا اے کاشکے مادر نزادے
وگر زادے بخورد سگ بدا دے
زن از پہلوے چپ گویند برخاست
نیاید ہر گز از چپ راستی راست

خوشا وقتے و خرم روزگارے
که یارے بر خورد از وصل یارے
ز غمزہ تیر و از ابرو کماں کن
شکار آں نگار دلستاں کن
مرا اے کاشکے مادر نمی زاد
و گرمی زاد کس شیرم نمی داد
زن از پہلوے چپ شد آفریدہ
کس از چپ راستی ہرگز ندیدہ

مگر ظاهرا ایسا معلوم هوتا ہے که دونوں نے نظامی کے کلام کا به نظر غائر مطالعه کیا ہے ۔ کیونکه جو کلام کبھی نظر سے نه گزرا ہو اس سے تو ارد ہونا محال ہے، احیاناً اگر ہو بھی گیا ہو تو معیوب نه سمجھا جائے گا بلکه یه بھی اس کی بلندئی طبع، اور رسائی فکر پر دلالت کرتا ہے۔

یورپ کی زبانوں میں نظامی کی مثنویات کے ترجمے :

اهل یورپ نے نظامی کے کلام کے جو حصے شایع اور ترجمه کیے اس کا مختصر حال یه ہے :

مخزن‌اسرار : جی ۔ ایچ ۔ ہنڈلی (G. H. Hindley)نے انگریزی میں ترجمه کیا جس کا قلمی مسودہ عجائب خانه لندن میں محفوظ ہے ۔

مخزن اسرار :متن مرتبه نیتھنیل بلینڈ (Nathaniel Bland) بمقام لنڈن ۱۸۴۴ء ۔

لیلیٰ و مجنوں : جیمس اٹکنسن (Games Atkinson) کا ترجمه در زبان انگریزی، لنڈن ۱۸۳۶ء ۔

هفت پیکر : سات حکایتوں میں سے ایک حکایت مع ترجمه در زبان جرمن ایف ۔ ارڈمین (F. Erdmann) نے شایع کیا بمقام قازان (Kasan) ۱۸۴۴ء ۔

سکندرنامهٔ بری: ۱ ۔ کیپٹن، ایچ ۔ولبرفورس کلارک صاحب(Capt. H. Wilber Force Clerk) نے انگریزی میں ترجمه کیا ۔ لنڈن ۱۸۸۱ء ۔

۲ ۔ ایف ارڈمین (F. Erdmann) کا انتخاب بزبان جرمن بمقام قازان (Kasan) ۱۸۳۸ء ۔

۳- خر موے صاحب (Chormoy) کا انتخاب در زبان روسی بمقام سینٹ پٹرزبرگ (St. Peters burg) ۱۸۲۹ء -
۴- اسپیگل (Spiegel) کا انتخاب به زبان جرمن به مقام لیپزیگ (Leipzig) -

سکندر نامه بحری: ۱ - ڈاکٹر ایتھ (Dr. Ethe) کا انتخاب در زبان جرمن ۱۸۷۱ء -
۲ - متن مرتبہ ڈاکٹر اسپرنگر (Dr. Sprenger) کلکتہ ۱۸۵۲ء و ۱۸٦۹ء -

کلام:

مثنویات خمسہ کے علاوہ نظامی کا اور بھی کلام ہے، چنانچہ دولت شاہ نے ان کی ایک غزل جس میں ان کا تخلص بھی موجود ہے - نقل کی ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے قصائد، غزلیات موشحات، اور صنائع کے بیس هزار شعر هیں - عوفی کا بیان ہے کہ 'بجز ان چند مثنویوں کے نظامی نے کچھ نہیں لکھا - نیشا پور میں میں نے ایک فاضل شخص کی زبانی ان کی ایک غزل سنی' - (۱) اس کے بعد اس نے پانچ پانچ شعروں کی تین غزلیں درج کی هیں جن میں سے آخری غزل میں نظامی نے اپنے فرزند دلبند کا ماتم کیا ہے - کشف الظنون میں لکھا ہے: 'دیوان نظامی فارسی من النظامی الگنجی صاحب الخمسة، - لطف علی آذر نے بھی آتشکدہ میں نظامی کے تین قصیدے نقل کیے هیں، اور لکھا ہے کہ نظامی کا کلام قصائد غزلیات، اور رباعیات کے کل بیس هزار شعر هیں جو بالفعل نایاب هیں - هدایت علی خان نے اپنے تذکرے (۲) میں نظامی کے تین قصائد (ایک ۲۴ شعر کا دوسرا ۱٦ شعر کا اور تیسرا ۳۷ شعر کا) اور تین تین چار چار شعروں کی ۹ غزلیں مع ایک رباعی کے نقل کی هیں - ڈاکٹر باخر نے اپنے تذکرۂ نظامی میں لیلیٰ و مجنوں کا ایک شعر درج کر کے اس سے استدلال کیا ہے کہ لیلیٰ مجنوں کی تصنیف کے بعد (۵۸۴ھ) نظامی نے اپنا دیوان مرتب کیا - مولف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لکھتا ہے:

'نظامی نے ۵۸۴ھ میں اپنے قصائد و غزلیات کے مجموعے کو جمع کر کے دیوان مرتب کیا، جو کہا جاتا ہے کہ بیس هزار اشعار هیں -

---

(۱) - لباب الالباب جلد ۲ ص ۳۹۷ مطبوعه یورپ -
۲ - مجمع الفصحا جلد اول ص ٦۳۷ -

گو اس کے صرف چند نسخے جو ہم کو دستیاب ہوے ہیں ایک قلیل تعداد اشعار کی رکھتے ہیں،۔

لیکن پروفیسر براؤن کی راے میں نظامی کا اور کلام نہیں ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

'مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسی تخلص کے اور بہت سے شعرا گزرے ہیں جن کا یہ کلام ہو سکتا ہے، اور اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے تو یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ایک مدت مدید سے بالکل معدوم اور نایاب ہے،۔

یہ صحیح ہے کہ اسی تخلص کے دیگر شعرا گزر چکے ہیں ۔ چنانچہ خود نظامی کے زمانے میں اس تخلص کے تین شاعر موجود تھے۔(۱) لیکن مذکورہ بالا بیانات کے علاوہ تمام کتب تذکرہ سے اس قول کی تائید ہوتی ہے اور اس کو تقویت پہنچتی ہے ۔ آغا احمد علی صاحب مرحوم کے پاس ایک مختصر دیوان نظامی کا موجود تھا جس کی نسبت وہ لکھتے ہیں :

'نزد بندہ احمد، یک موجز دیوان شیخ نظامی گنجوی، محتوی بر قصائد و غزلیات و رباعیات‌عارفانہ کہ تخمیناً ھمگی پانصدبیت خواھد بود موجود و کتاب خانہ از و شرفے نا محدود، ۔ (۲)

نظامی کی غزلیات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ 'باوجودیکہ انہوں نے بلبل کے نغمے اور گل کے رنگ و بو سے بہت کام لیا، پھر بھی اس کے الفاظ اور بندش میں غزلیت کا مزہ نہیں پیدا ہوا،(۳) چنانچہ تذکروں میں جتنی غزلیں پائی جاتی ہیں وہ پھیکی اور بے مزہ ہیں ملاحظہ ہو :

هزار باربجاں آمدست کاز مرا
نگشت عشق‌تو الا یکے هزار مرا

زخام کاری کارے چناں مکن بامن
کہ هیچ کار تو ناید بہ هیچ کار مرا

چو بے کناروسیان است عشق‌تو لابد
میان دل (کشد) از دیدہ درکنار مرا

---

(۱) ۔ چہار مقالہ نظامی عروضی سمر قندی۔
(۲)۔ ہفت آسمان مطبوعہ ۱۸۷۳ء کلکتہ ۔
(۳) ۔ سخندان فارس ص ۲۰۱ ۔

جو به جو سحنت من زان   رخ گندم گون است
که همه شب رخ پرکا هم ازان پر خون است
من چو گندم شده ام از غم او دل بدونیم
این غم اورا به یکے جو که نظامی چون است

اپنے جگر گوشے کے ماتم پر یہ غزل لکھی ہے :

اے شده همسر خوبان بہشت
آن چنان عارض و آنکه برخشت
خط نیاورده   بتو عمر   هنوز
این قضا بر سرت آخرچه نوشت
چه عجب گر شودی جان و جہان
خاک از دیدهٔ من خون آغشت
سبزه زاری خطت در خاک است
آب کے باز   توان   داد   بکشت

اس غزل کے مقابلے میں خواجہ حافظ کی اس غزل کو دیکھو جو نظامی ھی کی طرح انھوں نے بھی اپنے فرزند کے ماتم میں لکھی ہے، کتنی پر سوز و گداز ہے -:

بلبلے خون جگر خوردوگلے حاصل کرد
باد غیرت بصدش حال پریشان دل کرد
طوطئی را به هوا ے شکرے دل خوش بود
نا گہش سیل فنانفس امل باطل کرد
قرة العین من آن میوهٔ دل یادش باد
که خود آسان بشد و کار مرا مشکل کرد
ساربان بار من افتاد خدا را مددے!
که امید کرمم همره این محمل کرد
روے خاکی و نم اشک مرا خوار مدار
چرخ فیروزه طرب خانه ازیں کہگل کرد
نه زدی شاه رخ و فوت شدامکان حافظ
چه کنم بازئی ایام مرا غافل کرد

شاعری :

شاعری کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے، طبع رسا، تحصیل علوم، اور فیض یزدانی، چنانچہ انوری کہتا ہے :

شاعری راسه چیز می باید
تا که اشعار بر مراد آید
طبع و تحصیل و فیض یزدانی
هر کرا نیست ژاژ میخاید

مبداء فیاض سے نظامی کو یہ سب باتیں حاصل تھیں ۔ قدرت نے ان کو ازل ھی سے شاعری کی دولت سے مالا مال کر کے تمام باتوں سے مستغنی کر دیا تھا، ان کی بلند پرواز طبیعت نے فارسی شاعری میں وہ نقش آرائیاں کیں جو بعد میں متاخرین کا سرمایۂ ناز رھیں ۔

مثنوی ، قصائد، اور غزل لکھنے میں فردوسی، انوری، اور سعدی پیغمبران سخن مانے گئے ھیں ۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :

در شعر سه تن پیمبرانند
هر چند که لا نبی بعدی
ابیات و قصیده و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

لیکن جب قائل قطعۂ مذکور سے پوچھا گیا کہ تو نے ان تینوں کو تو پیغمبران سخن قرار دیا اور نظامی جو استاد بے بدل ھیں ان کا نام کیوں نہیں لیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے پیغمبران سخن کا ذکر کیا ہے اور وہ (نظامی) تو خدائے سخن ہے ۔

شعرائے ایران کسی نہ کسی صنف خاص میں کمالیت رکھتے تھے، چنانچہ فردوسی رزمیہ میں، خیام فلسفے میں ، سعدی عشقیہ اور پند و موعظت میں ، اور حافظ غزل سرائی میں ممتاز تھے ۔ لیکن نظامی کی نکتہ رس، اور معنی یاب طبیعت نے تمام انواع شاعری کو لیا، اور بدرجۂ کمال پہنچایا۔ پختگی کلام نظامی کا خاص شیوہ ہے۔ تمام شعرائے متوسطین و متاخرین اس بات پر متفق ھیں کہ ان کا ساپختہ گو آج تک پیدا نہیں ہوا ۔ امیر خسرو فرماتے ھیں:

نظم نظامی به لطافت چو در   وز دراو سر بسر آفاق پر
پخته از و شد چو معانی تمام   خام بود پختن سودائے خام

فیضی نے جہاں اور شعرائے نامور کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے :

ز سحرکاری گنجور گنجہ خیز سپرس
که داشت کلکش بر گنج غیب ثعبانی
بنظم او بر سد نظم غیر اگر برسد
مخیل متنبی بنص قرآنی

نظامی نے بہت سی باتیں ایجاد کیں، مثلاً :

سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں۔
سب سے پہلے انہی نے مخزن اسرار اور هفت پیکر کی بحر کو مثنوی میں داخل کیا۔
سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن) میں پانچ نعتیں لکھیں۔
سب سے پہلے انہی نے ساقی نامه کی داغ بیل ڈالی۔
سب سے پہلے انہی نے قصیدے کو مدح سے پاک کیا۔

استعاره اور تشبیه میں سب سے پہلے نزاکت اور لطافت جس نے پیدا کی وہ نظامی ہی ہیں اوز اس لحاظ سے وہ اس کے موجد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ استعارات و تشبیہات جن کو مضمون کے موثر اور دلآویز بنانے میں بہت بڑا دخل ہے، نظامی کے کلام میں کثرت سے مستعمل ہیں، اور ان کو نہایت لطیف پیرائے میں ادا کیا گیا ہے ۔ چند مثالیں ملاحظه ہوں:

(۱) پیغمبر (صلعم) کی نعت میں فرماتے ہیں۔

گزیں کردۂ هر دو عالم توئی
چو تو گر کسے باشد آں هم توئی

یعنی تجھ سا اگر کوئی ہے تو وہ خود تو ہی ہے ۔ جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی نظیر آپ ہے، اس میں مشبه اور مشبه به دونوں ایک ہیں ۔ اس صنف تشبیه کے مخترع هندی ماهران فن بدیع ہیں، اس کا نام انہوں نے 'اننیا النکار' رکھا ہے۔ فارسی میں اس قسم کی مثالیں اکثر پائی جاتی ہیں۔ ملا ظہوری کہتے ہیں :

چوں ظهوری بجز ظهوری نیست
در محبت یگانه سے باشد

دوسری جگہ کہتے ہیں :

نتواں گفت ز خوباں دگرےمی باشد
هم توئی از تو اگر خوب ترے می باشد

میرزا جلال طباطبائی نے اپنے منشآت میں یہ شعر نقل کیا ہے :

آب رخ آئینۂ جم منم
همچوسنے گو بود آں هم منم

(۲) مغے ارغواں کشته برجائے جو
بنفشه درودہ بوقت درو

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں پیدا ہوا، اس کو اس طرح ادا کیا کہ آتش پرست نے ارغواں بویا، اور بنفشہ کاٹا :

(۳) شکن گیر گیسوش از مشک ناب
زدہ سایه بر چشمۂ آفتاب

اس (معشوق) کی زلف پر شکن نے، جو مشک خالص سے بنی تھی، چشمۂ آفتاب (چہرہ) پر اپنا سایہ ڈالا :

(۴) ز سرسبزئ گنبد تابناک
زمرد شدہ لوح طفلان خاک

کہنا یہ تھا کہ نیلگوں آسمان کے فیض سے نباتات کا رنگ بھی ہرا ہو گیا ۔ اس کو اس طرح ادا کیا کہ گنبد تا بدار کی سر سبزی سے طفلان خاک (نباتات) کی لوح بھی زمرد ہو گئی ۔

(۵) لیلیٰ کے چہرے کی تعریف کرتے ہیں :

زلفش چو شبے رخش چو باغے
یا مشعلۂ بچنگ زاغے

لیلیٰ کی زلف کو رات سے، اور اس کے چہرے کو باغ سے تشبیہ دی ہے پھر دوسرے مصرع میں زلف کو کوے سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں اس کا باغ سا چہرہ رات جیسی زلفوں کے نیچے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوے کے پنجے میں کوئی مشغلے کی چیز ہو :

(۶) دخاں از بر شعلۂ آذری
چو بر سرخ گل برگ نیلو فری

آگ کا شعلہ بھڑکا اور اس میں سے جو دھواں اٹھتا تھا اس کو تشبیہ اور استعارے میں اس طرح ادا کیا کہ شعلے کے سر پر دھواں ایسا خوش نما

معلوم ہوتا تھا جیسے گل سرخ پر برگ نیلوفر یعنی معشوق کے سرخ سرخ رخسارہ پر سیاہ بال۔

اب ہم نظامی کی چند اقسام نظم، مثلاً، جذبات انسانی کا اظہار، منظر نگاری، عشقیہ، رزمیہ، اخلاقی، فلسفیانہ وغیرہ کو مختصراً بیان کرتے ہیں ۔

جذبات انسانی:

یہ بھی ایک شاعری کے انواع لطیفہ میں سے ہے۔ قدما میں سوائے فردوسی کے اس صنف میں نظامی کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ جذبات انسانی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ہو بہ ہو تصویر کھنچ جاتی ہے۔ مثلاً، سکندر کی دارا کے ساتھ مبارز طلبی، دارا کا خود اپنے نوکروں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مرنا۔ سکندر کا اس کے پاس جانا، اور دارا کا سر اپنی گود میں لینا۔ دارا کا اس سے حسرتناک باتیں کرنا، نظامی نے اس قدر اثر اور درد انگیز طریقے پر بیان کیا ہے جس سے جذبات انسانی مشتعل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے:

سر خستہ را بر سر ران نہاد
شب تیرہ بر روز رخشان نہاد

فرو بستہ چشم آن سر خوابناک
بدو گفت: 'بر خیز ازین خون و خاک

رہا کن که در من رہائی نماند
چراغ مرا روشنائی نماند

سپہرم بر آن گونه پہلو درید
که شد در جگر پہلو یم ناپدید

تو اے پہلوان! کامدی سوے من
نگہدار پہلو ز پہلوے من

که با آن که پہلو دریدم چو میغ
همی آید از پہلویم بوے تیغ

سر سروران را رہا کن زدست
تومشکن که سارا جہان خود شکست!

چه دستی که با ما درازی کنی
بتاج کیان دست بازی کنی

نگهدار دستت که دار است این!
نه پنهان چو روز آشکار است این
چو گشت آفتاب مرا روے زرد
نقابے بمن در کش از لا جورد
ببین سرورا در سر افگندگی
چومن شاہ را در چنین بندگی!
درین بندم از محنت آزاد کن
بآمرزش ایزدم شاد کن
رہا کن که خواب خوشم می برد
زمین آب و چرخ آتشم می برد
مگردان سر خفته را از سریر
که گردون گردان بر آرد نفیر
زمان من اینک رسد بے گمان
رہا کن به کام خودم یک زمان
اگر تاج خواهی ربود از سرم
یکے لحظه بگزار تا بگزرم
چومن زین ولایت کشادم کمر
تو خواہ افسر من ستان خواہ سر
سکندر بنالید، کاے تاجدار!
سکندر منم، چاکر شهر یار!
نخواهم که برخاک باشد سرت
نه آلودۂ خوں شود پیکرت
و لیکن چه سود است کیں کاربود
تاسف ندارد کنوں هیچ سود
اگر تاجور سر بر افراختے
کمر بند او چاکری ساختے
دریغا بدریا کنوں آمدم!
که تا سینه در موج خوں آمدم
چرا مرکبم را نیفتاد سم
چرا پے نه کردم دریں راہ گم
مگر نالۂ شاہ نشنیدمے
نه روزے بدیں روز هم دیدمے

بدارائے گیتی و دانائے راز
که دارم به بهبود دارا نیاز
و لیکن چو بر شیشه افتاد سنگ
کلید در چاره ناید بچنگ
دریغا که از نسل اسفند یار
همیں بود بس ملک را یادگار
چه بودے که مرگ آشکارا شدے
سکندر هم آغوش دارا شدے
بچاره گری چوں ندارم نواں
کنم نوحه بر زاد سروروان
چه تدبیر داری سراد تو چیست
امید از که داری وبیمت زکیست
چو دارا شنید آں دم دل نواز
بخواهش گری دیده تر کرد باز
بدوگفت: ''کلے بهتریں بخت من
سزاوار پیرایهٔ تخت من
چه پرسی؟ ز جان بجاں آمده
گلے در سموم خزاں آمده
ز بےآبیم سینه سوز دروں
قدم تا قدم غرق دریائے خوں
جهاں غارت از هر دیہے می برد
یکے آورد دیگرے می برد
نه زو ایمن آنانکه هستند نیز
نه آنانکه رفتند، رستند نیز
به بیں روز من راستی پیشه کن
تو نیز از چنیں روزے اندیشه کن

منظر نگاری:

مناظر قدرت میں باغ و بہار کی تعریف شعرائے ایران کا عام موضوع رہا ہے جس پر ابتدا سے آج تک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں ۔ چنانچہ نظامی نے بھی اس میں داد سخن دی ہے ۔ منوچہری دامغانی کے سوا قدما میں سے کسی نے نیچر کی ایسی دلکش تصویر نہیں کھینچی جیسی نظامی نے ۔ ملاحظہ ہو، سرسبز و شاداب مرغزار میں جانوروں کا چرنا ، پاس ہی

چشموں کا بہنا اشجار ثمرور کی سرسبز شاخوں کو نسیم صحرا کا ہلانا وغیرہ کا نظامی نے نیچرل سماں آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے :

چو مینو چراگاہے آمد پدید
که از خرمی سر به مینو کشید
به هر پنج گامے دراں مرغزار
روانه شده چشمهٔ خوشگوار
هوائے خوش و بیشه هائے فراخ
درختاں بار آورو سبز شاخ
رواں آب در سبزهٔ آب خورد
چو سیماب بر پیکر لاجورد
گیاهان نورسته از آب ہر
چو برشاخ سینا بر آورده در
پئے آهو از چشمه انگیخته
چو بر نیفها نافہاریخته
سم گور بر سبزه خارید جائے
چو بر سبزه دیبا خط مشکسائے
هوا ہے خس و سبزه بے خاربود
و گر بود خار انگبین دار بود
ز شیریں گیا هائے کوه و دره
شکر یافته شیر آهوبره
هر آهو که باداغ آزاده بود
ز نافه کشی نافش افتاده بود
گوزنے کزو روئے بر خاک داشت
بچشمش جهاں چشم تریاك داشت
حریر زمیں زیر سم ستور
شده کور چشم از پئے چشم گور

باغ کا نظارہ، انواع و اقسام کے پھولوں کا ذکر، طیور کی نغمہ سرائی :

خندید شگوفه بر درختاں
چوں سکهٔ روئے نیك بختاں
گل یافت ستبرق حریری
شد باد بگوشواره گیری

غنچه کمر استوار می کرد
پیکان کشی زخار می کرد
از لالهٔ لعل و از گل زرد
گیتی علم دورنگ بر کرد
نرگس ز دماغ آتشیں تاب
چوں تپ زدگاں نجسته از خواب
زاں چشمهٔ سیم کز سمن رست
نسرین ورقے که داشت می شست
نیلوفر از آفتاب گل رنگ
بر آب سپر فگنده بے جنگ
جوشیدن قطرهاے باده
خوں از رگ ارغواں کشاده
زلفین بنفشه از درازی
در پاۓ فتاد وقت بازی
سنبل سر نافه باز کرده
گل دست به او دراز کرده
سوسن نه زباں که تیغ در بر
نے نے غلطم که تیغ برسر
شمشاد به جعد شانه مے کرد
گلنار بهنار دانه مے کرد
سیرابیٔ سبزه هاے نوخیز
از لولوے تر زمرد انگیز
بلبل ز درخت سر کشیده
مجنوں صفت آه برکشید
دراج ز دل کباب انگیخت
قمری نمکے ز سینه می ریخت
هر فاخته برسر چنارے
در زمزمهٔ حدیث یارے
مرغان زباں گرفته چوں زاغ
بکشاده زبان مرغ در باغ

سراپا نگاری :

یعنی کسی چیز کا حلیہ بیان کرنا اکثر مدحیہ قصائد میں شعرا بادشاہ کی تعریف کے ساتھ اُس کی تلوار اور گھوڑے وغیرہ کی بھی تعریف کرتے تھے، قدما میں منوچہری نے اس میں زور سخن دکھایا، اور گویا وہی اس کا موجد بھی ہے۔ گو متاخرین بلندپروازی کرکے اس میدان میں آگے نکل گئے ہیں، لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں۔ نظامی نے بھی اکثر جگہ اپنی مثنویوں میں حلیہ نگاری کا استعمال کیا ہے، خصوصاً کسی معشوق کا حلیہ بیان کرنے میں اس قدر زور تخیل سے کام لیا ہے کہ متاخرین میں اور ان میں بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱ - سکندرخاقانِ‌چین کا مہمان ھے، خاقان نے کئی بیش بہا تحائف سکندر کی نذر کیے، ان میں سے ایک گل اندام معشوقہ (کنیز) بھی ھے، جس کا سراپا نظامی س طرح بیان کرتے ھیں :

کنیزے سیہ چشم و پاکیزہ روی
گل اندام و شکر لب و مشکبوی
خرامندہ ماھے چو سرو بلند
مسلسل دو گیسو چو مشکیں کمند
رخش بر بنفشہ گل انداختہ
بنفشہ نگہبان گل ساختہ
کمر بستۂ زلف او مشکتاب
کہ زلفش کمر بستہ بر آفتاب
بلوریں تن وقاقمیں پشت او
بہ شکل دم قاقم انگشت او
نزد بر کس از تنگ چشمی نظر
ز چشمش دھانش بسے تنگ تر
تو گفتی کہ خود نیست او را دھان
ھماں نام او ھست اندر جہاں
ز ابرو کماں کردہ از غمزہ تیر
بہ تیر و کمان کردہ صد دل اسیر
برد غبغبے کاب زوے چکید
بر آتش بر آب معلق کہ دید

۲ - روشنک دختر دا را کا سراپا:

رخی چون گل و آب گل ریخته
گلابے زہر چشم انگیخته
زبان کو ته و زلف و گردن دراز
لب چون شکر خال با او به‌راز
زنخ ساده و غبغب آویخته
میان لاغر و سینه انگیخته
فریبنده چشمے جفا جوے نیز
دوا بخش بیمار و بیمار نیز
شکن گیر گیسوش ز مشک ناب
زده سایه بر چشمهٔ آفتاب

عشقیه:

ایران کی شاعری کا اصل مایهٔ ناز عشقیه شاعری هے، نظامی پہلے شخص هیں جنهوں نے عشقیه شاعری کی صنف قائم کی، اور عشقیه مثنویاں لکھ‌کر اس کو اوج ترقی پر پهنچا دیا ۔ غزل‌گوئی کی ایجاد بهی ان هی سے هوی ۔ متقدمین کے زمانے میں شاعری میں عشق و عاشقی کی روح نه تهی، نظامی نے عاشقانه خیالات و جذبات کے اظهار کے لیے ایک مستقل لٹریچر پیدا کر دیا ۔ چنانچه ان کی مثنویاں اس بات کا بین ثبوت هیں جو عاشقانه خیالات و جذبات سے اس قدر لبریز هیں ۔ جس کی نظیر قد ما کی عشقیه مثنویوں میں نہیں ملتی ۔

رزمیه:

رزمیه نظم جس کو انگریزی میں ایپک پوئٹری EPIC POETRY کہتے هیں، ایک حد تک قوم کے شجاعانه جذبات کو بر انگیخته کرنے میں پورا دخل رکھتی هے ۔ اس لحاظ سے اهل یورپ اس کو بهترین نوع سخن میں شمار کرتے هیں، ان کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعرهومر هے جس کا فخریه کارنامه یہی رزمیه شاعری هے ۔ اس میں شبه نہیں که هومر کے برابر رزم، دنیا کا کوئی شاعر آج تک نہیں لکھ سکا لیکن اگر کوئی رزمیه نظم ایسی هے جس‌کو 'الیڈواڈیسی' کے پهلو میں جگه دی جا سکے، تو وه فردوسی کا شاه نامه هے ۔ شعرائے ایران میں رزمیه شاعری کے لحاظ سے فردوسی کا کوئی بهی مد مقابل نہیں ۔ اس صنف میں فردوسی کے بعد دوسرا نمبر نظامی کا هے ۔ چنانچه سکندرنامه جو شاهنامه هی کا عکس هے، نظامی کی رزمیه شاعری کا اعلیٰ ترین نمونه هے ۔ اس میں رزمیه کے تمام

اصول بہ وجہ احسن پائے جاتے ھیں۔ مثلاً شروع میں حربی باجوں کا بجنا، ہنگامۂ جنگ، اور شور دار و گیر، آلات حرب، رجز، دشمنوں پر حملہ کرنا وغیرہ باتوں کا پورا پورا اہتمام کیا گیا ھے :

حربی باجوں کا بجنا :

ز بس شورش کوس رونینہ طاس
به گردون گردان در آمد هراس
شغبهاے شیپور ز آ واز تیز
چو صور سرا فیل در رستخیز
ز نعرہ بر آوردن گاؤدم
شد از آسمان زهرۂ گاؤ گم
دهلهاے گرگینه چرم از خروش
در آورد مغز جهان را به جوش
ز شوریدن طنبک زخم ریز
دماغ فلک سفته از زخم تیز
ز شوریدن نالۂ کرنا ے
بر افتاد تب ارزه بردست و پاے
دل ترکتازان دران دار و گیر
بر آورد از نا ے ترکی نفیر

ہنگامۂ جنگ :

ز غوغا بر آوردن خیل روس
تگاور شده زیر شیران شموس
غبار زمین بر هوا راه بست
عنان سلامت برون شد ز دست
ز نعل سمندان پو لاد میخ
زمین را ز جنبش بر افتاد میخ
ز بس نعره کا مد برون از سکین
فرو اوفتاد آسمان بر زمین
در آمد به جنبش دو لشکر چو کوه
کزان جنبش آمد جهانے ستوه
بر انگیخت رزمے چو بارنده میغ
تگرگش ز پیکان و باران تیغ

زمینے ز گو گرد بے آب تر
هوائے ز دوزخ جگر تاب تر
چو لشکر به لشکر در آمیختند
قیامت ز گیتی بر انگیختند

آلات حرب :

به ابرو در آمد کمان راشکنج
شتابان شده تیر چون مار گنج
ستیزنده از تیغ سیماب ریز
چو سیماب کرده گریزا گریز
زپولاد پیکان لشکر شکن
تن کوه لرزید بر خویشتن
خدنگ سه پر کرده ز آهن گزار
چو مرغ دو پر بر سر مرغزار
زنیزه نیستان شده روے خاک
ز گوپالها کوه گشته مغاک
سنان برسر موے بازی کنان
به خون روے دشمن نمازی کنان
نهنگان شمشیر جوشن گداز
بگردن کشی کرده گردن دراز
لکد کو بهٔ گرزهٔ هفت جوش
بر آورد از گاو گردون خروش
زقارورہ و ناچخ و بید و برگ
قواره قواره شده درع و ترگ

رجز :

چنین گفت با پهلوانان روم
که فردا درین مرکز سخت بوم
بکوشیم کوشیدنی مرد وار
رگ جان بکوشش کنیم استوار
اگر دست بردیم ماراست ملک
و گر ما شدیم آن داراست ملک
قیامت که پوشیده از راے ماست
بود روزے آں روز فردا ے ماست

اسلحہ جنگ سے آراستہ ہو کر دشمن پر حملہ کرنا :

'جرم' نامی از کوہ 'لاکن' چو کوہ
در آمد گرزو عالم آمد ستوہ
یکے ترک زو آھنی برسرش
کہ پیکار می ریخت از پیکرش
قباے زرہ بر تنش تاب دار
چو سیماب روشن چو سیم آب دار
'بشروہ' در آمد چو شیردمان
ز گفتن ندادش زمانے امان
چناں راند شمشیر بر شیر مرد
کزاں شیر شرزہ بر آورد گرد
چو افتاد دشمن دراں پاے لغز
بہ سم سمندش بسائید مغز
'دوالی' چو دید آں چناں گردنے
نہ گردی بہ مانا کہ گردن زنے
بہ پیچید و پیر ایہ' جنگ خواست
پسیج شدن کرد در جنگ راست
تبارک بر آورد روی آھنیں
یکے ترک سفتہ ز پولاد چیں
حمایل یکے تیغ زہر آبدار
کمندے چو زلف بتاں تابدار
فرس رابرافگند برگستواں
بزین اندر آمد چو کوہ رواں
سوے دشمن آمد چناں تازہ روے
کہ طفل از دبستان در آید بکوے
'جرم' چوں دراں فر زیبندہ دید
دل از جنگ شیراں شکیبندہ دید
و لیکن نبودش سر باز گشت
بنا چار با مرگ دمساز گشت
بگرد 'دوالے' در آمد دلیر
دوالک همی باخت باتند شیر

بسی حرف در بازی اندوختند
ز رحمت یکے حرف ناسوختند
'دوالی' کمر بست چون شیرنر
زدش ضربتے بر دوال کمر
گزارنده شد تیغ بے ہیچ رنج
دو نیمہ شد آں کوہ فولاد سنج
بدینگونہ آں کوہ پولاد پشت
بسے گرد لشکر شکن را بکشت

اخلاقی شاعری:

نظامی کا کلام اخلاقی شاعری سے مملوھے ، خصوصاً مخزن اسرار، جوان کی سب سے پہلی مثنوی ھے خاص اسی موضوع پر مشتمل ھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے تمام کلام میں جابجا اخلاقی باتیں درج ھیں۔کسی نے ان کے تمام اخلاقی اشعار کو یکجا جمع کر کے اس کا نام ''انتخاب پنج گنج،، رکھا ھے۔ اس مجموعے کا ایک نہایت خوش‌خط اور مطلا قلمی نسخہ ریاست جونا گڑھ کی بہادر خانجی لائبریری میں میری نظر سے گزرا ھے۔

فلسفیانہ شاعری:

علامہ شبلی فرماتے ھیں کہ 'فلسفیانہ مسائل نظامی نے اس حد تک لکھ دیے ھیں کہ زبان کی کم مایگی کی شکایت نہیں ھو سکتی، اور اگر متاخرین ان کے نقش قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بن گئی ھوتی'۔ بلا شبہ نظامی نے جہاں فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا ھے وھاں بہت کم عربی الفاظ کو دخل دیا ھے، لیکن اس سے فارسی کا فلسفیانہ زبان بن جانا ایک غیر متوقع امر تھا، کیونکہ اول تو جتنی فلسفیانہ اصطلاحات عربی زبان کی ھیں ان کو اگر فارسی کا جامہ پہنایا جاتا تو بلحاظ غیر مانوس ھونے کے ان کے سمجھنے میں بڑی دقت واقع ھوتی اور فلسفے کی حالت فارسی زبان میں آ کر ایسی ھو جاتی جیسی آج کل کسی عمدہ انگریزی ناول کے اردو ترجمے کی۔ یہی سبب ھے کہ بوعلی سینا کی حکمت علائیہ معما ھو کر رہ گئی۔ دوسرے یہ کہ نظامی نے فلسفے کے صرف چند مسائل بیان کیے ھیں جن میں سے اکثر تو فلسفۂ اخلاق سے متعلق ھیں، اور بعض النہیات اور طبیعات کے،

اور وہ بھی ابتدائی مسائل مثلاً، ابتدائے موجودات، عناصر، سلسلۂ علل وغیرہ کے متعلق صرف یونانی حکما کی آراء نقل کی ہیں، علاوہ ازیں جو اصطلاحیں نظامی نے عربی سے فارسی کے قالب میں ڈھالیں وہ ایسی ہیں کہ بڑی مشکل سے سمجھ میں آ سکتی ہیں - مثلاً : پوینده، فرسودن، توانائی' بخش، افسردگی، کیا ان سے کوئی شخص متحرک بالارادہ، تغیر، وجود، نوع، اور قسر کے معنی سمجھ سکتا ہے ؟

تجاذب اجسام :

علم طبیعات کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ کل اجسام، اور کل ہستیاں مختلف ذرات سے مرکب ہیں - ہر جسم اور ہستی خواہ کسی نوع سے ہو، اپنی نوع کے ساتھ ایک قسم کی کشش اتصالی رکھتی ہے - یہی کشش 'نظام‌نسبت، کا جزو اعظم ہے جس پر عالم ایجاد و تکوین کا دارومدار ہے - حکما نے اس کو ''تجاذب اجسام'' کے نام سے موسوم کیا ہے، لیکن نظامی اپنی شاعرانہ زبان میں اس کو بہ الفاظ دیگر 'عشق، سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس اہم مسئلے کو معمولی مثالیں دے کر یوں سمجھاتے ہیں :

هر آن جوهر که هستند از عدد بیش
همه دارند میل مرکز خویش
گر آتش بر زمین منفذ نیابد
زمین بشگافد و بالا شتا بد
و گر آبے بماند در هوا دیر
بمیل طبع هم راجع شود زیر

که مقناطیس گر عاشق نه بودے
بداں شوق آهنے راکے ربودے
و گر عشقش نبودے در گزرگاه
نبودے کہربا جوینده کاه
طبائع جز کشش کارے ندارند
حکیماں ایں کشش را 'عشق، خوانند

اسی کو ایک انگریزی شاعر نہایت آسان طریقے سے یوں ذہن نشیں کراتا ہے :

چشموں کو دریا میں مل جانے کا اشتیاق ہے،اور دریاؤں کو سمندر کا۔ آسمان کی ہوائیں نہایت دلی جوش کے ساتھ باہم ہمکنار ہوتی ہیں ۔

دیکھو، اونچے اونچے پہاڑ فلک سے بوسہ ستانی کر رہے ہیں اور سمندر کی موجیں ہم آغوش ہوتی ہیں ، اس گل کو کون اچھا کہے گا جو اپنے بھائی پھولوں سے الفت نہ کریے گا؟ اور سورج کی روشنی زمین سے بغل گیر ہوتی اور چاند کی کرنیں سمندر کو چومتی ہیں۔

---

۱ ۔ ماخوذ از نظم ۔ (Loves Philosophy.) 'فلسفہ' عشق، مصنفہ ۔ (P. B. Shelly.) پرسی بیسی شیلے ۔

تاریخ وفات نظامی گنجوی

۵۳۶ — ۵۹۹ ھ

اختلاف سنین :

فارسی شعرا کے حالات میں عام طور پر سنین و تواریخ بلحاظ صحت مشتبہ اوربسااوقات مختلف پائی جاتی ہیں، لیکن جیسا شدید اختلاف نظامی کی تاریخ وفات میں ہے شاید ہی کسی شاعر یا مصنف کی نسبت پایا گیا ہو، اس کی وجہ زیادہ تر یہی معلوم ہوتی ہے کہ نظامی کی مثنویاں جن سے ان کی تاریخ وفات پر اتنااستناد کیا جاتا ہے اغلاط و تصحیفات سے لبریز ہیں، چنانچہ ان مثنویوں کی تواریخ تصنیف متعدد نسخوں میں آپس میں ایک دوسری سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان سے صحیح سنین و تواریخ کا معلوم کرنا بہت دشوار امر ہے، یہی سبب ہے، کہ تمام تذکرہ نویس نظامی کی تاریخ وفات پر متفق نہیں ہیں ۔

نظامی کا تذکرہ لکھنے والوں میں سب سے قدیم محمد عوفی صاحب لباب الالباب ہے، مگر اس نے سوائے چند بےمعنی مدحیہ سطور اور چند غزلیات نظامی کے اور کچھ نہیں لکھا، اس کے بعد قدیم مآخذ میں مولانا جامی ہیں جنھوں نے بہارستان اور نفحات الانس میں نظامی کا مختصر تذکرہ لکھا ہے، انھوں نے آخرالذکر کتاب میں اتمام سکندرنامہ کی تاریخ ۵۹۲ھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نظامی کی عمر اس وقت ساٹھ سال سے متجاوز تھی (۱)

---

(۱) ۔ نفحات الانس ص ۵۳۸ مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۵ء ۔

ان کے علاوہ اور کئی مورخین اور تذکرہ نویسوں نے نظامی کی تاریخ وفات کا ذکر کیا ہے ۔ جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ۔

مشرقی مصنفین کی دی ہوئی تاریخیں :

۱ ۔ مشہور جغرافیہ نویس قزوینی نے گنجہ کا ذکر کرتے ہوئے نظامی کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اور تاریخ وفات تقریبا ۵۹۰ھ بتائی ہے (۱)

۲ ۔ دولت شاہ سمر قندی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ نظامی نے طغرل بن ارسلان کے عہد (۵۷۱ - ۵۹۰ھ) میں وفات پائی اور ۵۷۶ھ تاریخ وفات بیان کی ہے (۲)

۳ ۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں مختلف مقامات پر مختلف تاریخیں لکھی ہیں : ۵۷۶ھ، ۵۹۶ھ، ۵۹۷ھ، ۵۹۹ھ۔(۳)

۴ ۔ ملاعبدالنبی نے میخانہ میں ۸۴ برس کی عمر پر ۶۰۲ھ میں نظامی کی وفات بیان کی ہے (۴) جو یقیناً غلط ہے، جیسا کہ خود اس کتاب کے مدون کا خیال ہے (۵)

۵ ۔ لطف‌علی‌آذر نے (بقول ریو) ۵۸۶ھ لکھی ہے، (۶) مگر بمبئی والے نسخے میں یہ سنہ نہیں پایا جاتا، کہ لفظ 'سنہ، کے بعد اس میں سے تاریخ محذوف ہے ۔ (۷)

۶ ۔ تاریخ حبیب السیر میں صرف اتمام سکندر نامہ کی تاریخ بقول جامی بیان کی گئی ہے لیکن حاشیہ پر محمد تقی تستری نے ایک مختصر نوٹ لکھا ہے جس میں سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۷ھ بتا کر تذکرۂ نتائج الافکار اور صبح صادق کے حوالے سے نظامی کا اس تاریخ کے بعد پانچ سال اور زندہ رہنا ثابت کیا ہے اور اس لحاظ سے ۶۰۲ھ تاریخ وفات بتائی ہے ۔(۸)

۷ ۔ تاریخ جہاں آرا میں (بقول ریو) ۵۹۷ھ ہے ۔(۹)

---

(۱) ۔ آثارالبلاد القزوینی ص ۳۵۲ مطبوعہ یورپ (۲) تذکرہ دولت‌شاہ ص ۱۳۱ مطبوعہ یورپ ۔ بمبئی والے نسخے میں صرف سنہ 'سبعین، لکھا ہے (دیکھو ص ۱۱) (۳) کشف الظنون جلد اول ص ۵۲۵ و ص ۵۷۴ و ص ۴۶۲، جلد دوم ص ۴۰۸ (۴) میخانہ ص ۱۱ (۵) حواشی میخانہ ص ۴ (۶) فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم ص ۵۶۴ (۷) آتشکدہ طبع بمبئی ص ۱۴۲ (۸) تاریخ حبیب السیر جز چہارم از جلد دوم ۱۱۲ کا حاشیہ (۹) فہرست مخطوطات فارسی جلددوم ص ۵۶۴ ۔

(۸) مخبرالواصلین میں 'گنجوی گل جنت' مادۂ تاریخ لکھا ہے، جس سے ۵۹۲ ھ برآمد ہوتی ہے صاحب مفتاح (۱) اور مولانا آزاد نے اتمام سکندر نامہ کی تاریخ ۵۹۷ ھ نقل کر کے اس تاریخ کی تغلیط کی ہے - (۲)

(۹) تقی کاشی صاحب صبح صادق نے (بقول اسپرنگ) ۶۰۶ھ لکھی ہے - (۳)

(۱۰) ہدایت قلی نے اپنے تذکرے (۴) میں ۵۷۶ ھ (غالباً دولت شاہ کے تتبع میں) لکھی ہے -

مستشرقین یورپ کی دی ہوئی تاریخیں :

ان مشرقی ماخذ، نیز اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر مستشرقین یورپ نے مندرجہ ذیل سنین لکھے ہیں۔

۱ - مہل (دیباچہ شاہنامہ ص ۷۲)
۲ - جان ہیمر (تاریخ ادب فارسی)
۳ - ارڈمین فلوگل (تاریخ ادب فارسی)
} ۵۷۶ ھ (۵)

۴ - سر گور اوسلی : ۵۹۷ھ (۶)

۵ - ڈاکٹر باخر: ۵۹۹ھ (۷)

۶ - ڈاکٹر ریو: ۵۹۸-۹۹ھ (۸)

۷ - ڈاکٹر ایتھے : ۵۹۹ھ (۹)

---

(۱) - مفتاح التواریخ (۲) نگارستان فارسی ص ۶۶، (۳) - اودھ کٹیلاگ ص ۱۷ (۴) مجمع الفصحاء جلد اول ص ۶۳۷، طبع ایران (۵) ترجمہ سکندر نامہ از ولبرزرس کلارک (دیباچہ) (۶) بیوگرافیکل نوٹس آف پرشین پوئٹس ص ۴۸ (۷) باخر نے نظامی کے سوانح اور تصانیف پر ایک محققانہ رسالہ جرمن زبان میں لکھا ہے جس کا نام (نظامیز لیبنڈ ورک) ہے اور ۱۸۷۱ھ میں شائع ہو چکا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ رابنسن نے اپنی کتاب (پرشین پوئٹری فار انگلش ریڈرز) میں شامل کیا ہے جو ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئی ہے دیکھو کتاب مذکور ص ۱۰۵ تا ۱۱۳ (۸) فہرست مخطوطات جلد دوم ۵۶۰ (۹) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۷، ص ۵۲۱ -

۸ - ڈاکٹر سودی: ۵۹۷ھ (۱)
۹ - پروفیسر براؤن: ۵۹۹ھ (۲)

ان سب میں جرمنی کے مستشرق باخر نے خود نظامی کی مثنویات کے بعض اشعار کی بنا پر ان کی تاریخ وفات سے متعلق ایک نظریہ قایم کیا ہے جس کی اکثر مستشرقین نے تائید کی ہے، یہ نظریہ اپنی تفصیلات کے اعتبار سے قابل غور ہے، اور ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

باخر کا نظریہ :

(الف) نظامی نے لیلیٰ مجنوں کی تاریخ تصنیف ۵۸۴ھ بیان کی ہے، جیسا کہ اشعار ذیل سے ثابت ہوتا ہے :

بر جلوهٔ این عروس آزاد
آباد تر آن که گوید آباد
کاراسته شد به بهترین حال
در سلخ رجب به ثا وفا و دال
تاریخ عیان که داشت باخود
هشتادوچهار بعد پانصد

اس مثنوی کے اختتام کے وقت نظامی کی عمر انچاس برس کی تھی جیسا کہ اسی مثنوی کے سبب تالیف میں فرماتے ہیں:

مجموعهٔ هفت سبع خواندی
یا هفت هزارسال ماندی

اور:

نیران سحر سحر گهی که را نم
مجموعهٔ هفت سبع خوانم

---

(۱) شمس العلما ڈاکٹر جمشید جی سودی بمبئی کے مشہور علم دوست پارسی مستشرق اور ایرانیات و پہلویات کے بڑے محقق عالم تھے، جنھوں نے گزشتہ ماہ اپریل میں انتقال کیا۔ سکندر نامہ کے ایک قلمی نسخے مکتوبہ ۱۰۱۲ھ پر سے انھوں نے نظامی کی تاریخ وفات پر ایک مضمون رایل ایشیاٹک سوسائٹی (شعبهٔ بمبئی) کے جلسے میں پڑھا تھا جو اسی سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا تھا (۲) لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۴۰۰ -

اب اگر ۵۸۴ھ سے ان کی عمر کے ۴۹ سال وضع کیے جائیں تو ۵۳۵ھ ان کا سال ولادت ہوتا ہے

(ب) خمسہ نظامی کے کسی جامع یا حاشیہ نویس نے جس نے بعد میں ان کی تدوین و ترتیب کی ہوگی سکندر نامہ کے آخر میں نظامی کی وفات کے متعلق اشعار ذیل اضافہ کردیے ہیں :

نظامی چو این داستان شد تمام
بعزم شدن تیز برداشت گام
نہ بس روزگارے بر این بر گزشت
کہ تاریخ عمرش ورق در نوشت
فزون بودشش مہ زشصت و سہ سال
کہ بر عزم رہ بردہل زد دوال

ان اشعار کے مطابق نظامی نے سکندر نامہ کے اتمام کے بعد ہی وفات پائی ہے اور اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال (یا ۶۳½) کی تھی، لہذا اگر ۵۸۴ھ میں ان کی عمر ۶۴ سال کی ہو تو لازمی ہے کہ پندرہ سال کے بعد (۴۹+۱۵=۶۴ سال=۵۸۴ھ+۱۵=۵۹۹ھ) جب کہ انہوں نے انتقال کیا ۵۹۹ھ تاریخ وفات ہونی چاہیے۔

نظریہ مذکورۂ بالا سے معلوم ہوگا کہ باخر نے خود مصنف کی سند پر نہیں بلکہ اس مدون یا جامع خمسہ کے قول پر اس کی بنیاد رکھی ہے، جس نے نظامی کی عمر ۶۳½ بتائی ہے۔

باخر کا خیال ہے کہ نظامی نے سکندر نامہ کی تاریخ تصنیف نہیں بیان کی، چنانچہ وہ لکھتا ہے ' سکندر نامہ کی تاریخ تصنیف کا تعین ہنوز باقی ہے جس کو نظامی نے براہ راست نہیں بیان کیا۔ (۱)

لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ باوجودیکہ سکندرنامہ کے دونوں حصوں (شرف نامہ و اقبال نامہ یابری وبحری) میں سنین تصنیف ۵۹۷ھ اور ۵۹۹ھ علی‌الترتیب دیے گئے ہیں، باخر کو یاتو سکندر نامہ کے وہ مخطوطے نہیں ملے جن میں یہ سنین موجود ہیں یا اس نے ان کو صحیح نہیں تسلیم کیا۔

باخر کے تمام نظریے کی بنیاد لیلیٰ مجنوں کے اشعار مندرجہ بالا ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ 'ہفت سبع خواندان، کے معنی سات کو

---

(۱) دیکھو رابنسن کی کتاب ص ۱۱۲

سات سے ضرب دینے کے کیسے ہو گئے؟ فارسی کے کسی معتبر لغت یا فرہنگ میں اس کے یہ معنی نہیں پائے جاتے، تعجب ہے کہ باخر کی کورانہ تقلید میں تمام مستشرقین حتیٰ کہ ریو اور براؤن جیسے محققین بھی اس کو ان معنوں میں صحیح سمجھتے ہیں 'ہفت سبع' سے مراد قرآن کریم کی سات منزلیں یا حصے ہیں جو قاریوں نے قرأت کی سہولت کی غرض سے مقرر کیے ہیں تا کہ ایک ہفتے میں پڑھا جا سکے (۱) سعدی نے بھی ایک شعر میں 'ہفت سبع خواندن' کا ذکر کیا ہے :

اگر خود ہفت سبع از بر بخوانی

چو آشفتی الف‌باتا ندانی (۲)

بہر حال اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر باخر نے جو نظریہ قائم کیا ہے، گو نتیجے کے لحاظ سے وہ صحیح ہو، مگر تفصیلات کے لحاظ سے غلط ہے، چنانچہ ڈاکٹر ریو کے قول سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ناکافی سواد کی وجہ سے باخر کے نتائج کی تفصیل اغلاط سے پاک نہیں ہے۔(۳)

تاریخ وفات معلوم کرنے کا صحیح اور مکمل طریقہ :

ہمارے خیال میں نظامی کی تاریخ وفات معلوم کرنے کا بہترین اور مکمل طریقہ یہ ہے، کہ مثنویوں کی تاریخ تصنیف، ان کی عمر کی نسبت اشارات، ان کے صاحبزادے کی عمر، ان فرمانرواؤں کے سنین حکومت جن کے نام پر یہ مثنویاں معنون ہوئی ہیں ان سب میں صحیح طور پر سطابقت دے کر تاریخ وفات معلوم کی جائے تا کہ بعد میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو۔ چنانچہ مندرجہ ذیل طریقے سے نظامی کی تاریخ وفات کے متعلق ہم ایک صحیح نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں :

(الف) تاریخ ولادت۔

۱۔ مثنوی شیرین خسرو کا سال اتمام معتبر قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے مطابق ۵۷۶ھ ہے :

گزشت از پانصد و هفتاد و ششی سال

نزد بر خد خوبان کس چنین خال (۴)

---

(۱)۔ غیاث‌اللغات ص ۵۵۲ رزاقی پریس کانپور (۲) گلستان باب پنجم (۳) فہرست مخطوطات جلد ۲ص ۵۶۴ (۴) خمسہ نظامی کے بعض قدیم

(بقیہ اگلے صفحے پر)

اگر چه طغرل بن ارسلان سلجوقی (۵۷۳ھ-۵۸۷ھ) کی مدح، محمد جہان پہلوان اتابک کی وفات (۵۸۲ھ) کا ذکر قزل ارسلان کے قتل (۵۸۷ھ) کا واقعہ اور ابوبکر نصرۃالدین اتابک (۵۸۷-۶۰۷ھ) کی وفات اتنی چیزیں اس مثنوی میں پائی جاتی ہیں لیکن ان سے صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ نظامی نے اسی کتاب کو طغرل کے بعد قزل کے نام اور اس کی وفات کے بعد نصرۃالدین کے نام سے، جو فرمانروایان وقت تھے منسوب کیا تھا اور اس لیے یہ مدحیہ اشعار بعد کو اضافہ کیے گئے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اصل کتاب ۵۷۲ھ سے شروع ہو کر ۵۷۶ھ میں پوری ہو چکی تھی، جیسا کہ خود نظامی نے تصریح کی ہے۔

۲۔ اس مثنوی میں وہ اپنے صاحبزادے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ببین این هفت ساله قرة العین
مقام خویشتن در قاب قوسین

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے صاحبزادے کی عمر اس وقت سات سال کی تھی۔ سبب نظم کتاب میں نظامی نے اپنے ایک دوست کی زبانی اپنی عمر چالیس کی بتائی ہے :

پس ازپنجاہ چله در چهل سال
سزن پنجه برین حرف ورق سال

اس طرح معلوم ہوا کہ ۵۷۶ھ میں نظامی کی عمر تقریبا ۴۰ سال کی تھی، اب اگر اس سنہ میں سے ان کی عمر کے چالیس برس کی تفریق کی جائے تو ان کا سال ولادت ۵۳۶ھ ہو گا۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

نسخوں (موجودہ برٹش میوزیم) میں هفتادویک، هفتادودو اور هفتادونه تک سنین پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں قدیم تر نسخہ مکتوبہ ۸۰۲ھ کے ورق ۸۱ هفتادوشش ۵۷۶ھ ہی لکھا ہوا ہے یہی سن مخطوطات نمبر ۲۵۹۰۰ (مکتوبہ ۸۴۶ھ) نمبر ۲۷۲۶۰ اور دیگر قدیم نسخوں میں پایا جاتا ہے اسی طرح طہر ان کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی هفتادو شش موجود ہے (دیکھو فہرست ریو جلد دوم ۵۶۶) بمبئی کے پرنس آف ویلز میوزیم میں خمسۂ نظامی کا ایک مخطوطہ مکتوبہ ۹۹۱-۹۲ھ موجود ہے اس میں بھی هفتادو شش ہی لکھا ہوا ہے۔

(ب) تاریخ وفات :

۱ - مثنوی لیلیٰ مجنوں ۵۸۴ھ میں لکھی گئی، جیسا کہ اس کے تاریخی حروف اور سال اتمام سے صاف ظاہر ہے :

کاراستہ شد بہ بہترین حال
در سلخ رجب بہ ثا وفا دال
تاریخ عیاں کہ داشت باخود
هفتاد (۱) و چہار بعد پانصد

اس مثنوی کی تصنیف کے وقت ان کے صاحبزادے کی عمر ۱۴ سال کی تھی، چنانچہ اس کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

اے چار دہ سالہ قرةالعین
بالغ نظر علوم کونین

اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مثنوی شیرین خسرو کی تصنیف کے وقت یعنی ۵۷۰ھ میں ان کے صاحبزادے کی عمر سات سال کی تھی اور ان کی عمر چالیس سال کی، اس طرح لیلیٰ مجنوں، خسرو شیریں سے سات سال کے بعد لکھی گئی یا یوں کہیے کہ ۵۸۴ھ میں ختم ہوئی، لہذا اس حساب سے نظامی کی عمر اس سنہ میں ۴۷ یا ۴۸ سال کی ہونی چاہیے ۔

۲ - لیلیٰ مجنوں کے ۳ سال بعد یعنی ۵۸۷ھ میں سکندر نامہ یا شرفنامہ کا آغاز ہوتا ہے (کہ اس کا زمانہ تصنیف ۵۸۷ سے ۵۹۷ھ تک ہے) جیسا کہ اپنے صاحبزادے کی عمر ۱۷ سال کی جو ۵۸۷ھ ہی میں ہو سکتی ہے بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

وزیں هفدہ فصل آوریدن بدست
شدہ هفدہ سالہ بدیساں کہ هست (۲)

اسی میں وہ اپنی عمر پچاس برس کی بتاتے ہیں :

چو تاریخ پنجہ در آمد بہ حال
دگرگونہ شد شتابندہ حال

---

(۱) حاشیے پر هشتاد درج ہے۔ اور یہی درست بھی ہے۔ کیونکہ حرف 'فا' کے عدد اسی (۸۰) ہوتے ہیں ۔ (مرتب)

(۲) ۔ سکندر نامہ (شرف نامہ) ص ۲۰ ۔ طبع بمبئی ۱۳۲۸ھ ۔

یعنی ۵۸۷ھ میں نظامی کی عمر پچاس سال کی تھی، اس مثنوی کی تاریخ اتمام ۵۹۷ھ اشعار ذیل سے معلوم ہوتی ہے :

به گفتم من این نامه یاور جہاں
که تا دور آخر بود در جہاں
بتاریخ پانصد نودهفت سال
چہارم محرم بوقت زوال (۱)

۳ ـ سکندر نامه کا دوسرا حصه یا اقبال نامه ۵۹۹ھ میں اتمام کو پہنچتا ہے، جیسا که فرماتے ہیں :

جہان بر دھم‌روز بود از ایار نودنه گزشته ز پانصد شمار (۲)

اس طرح ۵۸۷ھ سے لےکر ۵۹۹ھ تک سکندرنامه (ہر دو حصه) کی تکمیل ہوتی ہے اور اسی طرح اثناء (غالباً ۵۸۷ھ) میں وہ اپنی عمر ۶۰ برس کی بتاتے ہیں :

---

(۱) ـ آغا احمد علی (ہفت آسمان ص۹۲) کو ان اشعار کی صحت میں کلام ہے ـ کیونکه یه اشعار سکند نامه جلد اول کے کسی نسخے میں ان کی نظر سے نہیں گزرے، علاوہ ازیں ان کے نزدیک ابیات کی رکاکت اور قافیه کی تکرار اس کے موید ہیں که یه اشعار نظامی کے نہیں ہو سکتے، لیکن آغاصاحب کی یه رائےدرست نہیں معلوم ہوتی۔ خمسهٔ نظامی کی کثرت اغلاط و تصحیفات پر نظرکرتے ہوئے بہت ممکن معلوم ہوتا ہے که کتابت کی غلطیوں کی وجه سے ان اشعار کی صورت مسخ ہو گئی ہو، مگر اس میں شک نہیں که ان اشعار سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یه مصرعهٔ تاریخی ایک سے زیادہ قلمی اور مطبوعه نسخوں میں پایا جاتا ہے، جیسا که ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے (جلد دوم ص ۵٦۸) که برٹش میوزیم کےمخطوطات سنه ۱۰۹۰ھ، اور ۱۱۱۷ھاور ۱۲۲۷ھ میں یه تاریخ موجود ہے۔ ڈاکٹر سودی نے بھی اپنے مضمون میں جو نسخهٔ مکتوبه ۱۰۱۲ھ کا ذکر کیا ہے اس میں بھی یه اشعار باختلاف بعض الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بمبئی کے دو مطبوعه نسخوں (۱۲٦۵ھ اور ۱۳۲۸ھ) میں بھی یہی اشعار موجود ہیں۔ پھر قرائن بھی اسی تاریخ کے موید ہیں۔ لہذا حصهٔ اول کا سنه تصنیف ۵۹۷ھ صحیح معلوم ہوتا ہے (۲) سکندر نامه بحری مرتبه ڈاکٹر اسپرنگر مطبوعه کلکته ایشیاٹک سوسائٹی ص ۷۰۹ ـ خمسهٔ نظامی کے ایک نسخے مکتوبه ۹۳٦ھ موجودہ برٹش میوزیم و فہرست ریو جلد ۲ ص ۵۷۰ ـ ۷۱ میں بھی یہی تاریخ موجود ہے ـ

بشصت آمد اندازۂ سال من نگشت از خود اندازۂ حال من(۱)
اس حساب سے ۵۹۹ھ میں سکندر نامہ ختم ہوا، اس وقت ان کی عمر ۶۲ یا ۶۳ سال کی ہوتی ہے۔

۴۔ اب ان اشعار کو لیجیے جو کسی نے سکندر نامہ بحری یا اقبال نامہ کے آخر میں 'انجام‌ش روز گار نظامی رحمۃ اللہ علیہ' کے عنوان سے الحاق کر دیے ہیں۔ ان اشعار کا لکھنے والا غالباً جامع اوراق یا کاتب ہوگا، جو معلوم ہوتا ہے، کہ نظامی کے دم واپسین کے وقت حاضر تھا، اور جس کو نظامی کی عمر کا بھی صحیح علم تھا۔
ممکن ہے کہ وہ نظامی کا کوئی قریبی عزیز یا دوست ہو، بہر حال یہ اشعار قدیم ترین نسخوں میں بھی پائے جاتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

نظامی چو این داستان شد تمام
بعزم شدن تیز برداشت گام
ز بس روزگارے بر این بر گذشت
کہ تاریخ عمرش ورق در نوشت
فزون بودشش مہ زشصت و سہ سال
کہ بر عزم رہ بردھل زد دوال
چون حال حکیمان پیشینہ گفت
حکیمان بخفتند و او نیز خفت
رفیقان‌خود را بگاہ رحیل
گہ از رہ خبر داد و گہ از دلیل
بخندید و گفتا کہ آمرز گار
بآمرزشم کرد امید وار
ز مارحمت خویش دارید دور
[illegible] شماوین‌سرا، ما و دارالسرور
درین گفتگو بود خوابش ربود
تو گفتی کہ بیداریش خود نبود۔(۲)

اشعار مرقومہ بالا سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں جو زیادہ قرین قیاس ہیں۔ ایک یہ کہ داستان سکندر نامہ ختم ہونے کے بعد بہت ہی

(۱)۔ سکندر نامہ بحری ص ۱۸۹ طبع اسپرنگر (۲) سکندر نامہ بحری مرتبہ اسپرنگر ص ۱۸۲۔

قلیل عرصے میں نظامی نے وفات پائی، دوسری یہ کہ انتقال کے وقت نظامی کی عمر ۶۳½ برس کی تھی، لہذا اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے، کہ ۵۹۹ھ میں نظامی ۶۳½ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اور کہ ۵۹۹ھ میں یعنی اتمام سکندر نامہ کے ساتھ ہی ان کا بھی خاتمہ بالخیر ہو گیا، جیسا کہ ریو، ایتھے، باخر، اور براؤن کا خیال ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ ۵۹۹ھ تک زندہ تھے۔

پروفیسر شیرانی کی تحقیق:

اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پروفیسر محمود خان شیرانی ۶۰۷ھ تک نظامی کا زندہ رہنا بتاتے ہیں، چنانچہ اپنی تنقید شعر العجم میں فرماتے ہیں:

'نظامی کی وفات کا حادثہ اقبال نامہ کے اختتام کے بعد تصور کرنا چاہیے'۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن آگے چل کر سکندر نامہ کی مختلف اشاعتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اس کی آخری اشاعت اتابک نصرۃالدین ابوبکر کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، اور ۶۰۷ھ میں اس کی وفات کے بعد نظامی اسی کتاب کو نور الدین ارسلان شاہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔' (۱)

غالباً شیرانی صاحب کو مندرجۂ ذیل اشعار پر سے دھوکا ہوا ہوگا، جو سکندر نامہ بحری کے بعض قلمی نسخوں میں پائے جاتے ہیں، اور جن کو ڈاکٹر ریو (۲) نے بھی نقل کیا ہے:-

طرفدار موصل بمردانگی — قدر خوان شاہان بفرزانگی
سرسرفرازان گردن کشاں — ملک عزالدین قاہر شہنشاں
بطغرائے دولت چوطغرل تگیں — ابوالفتح مسعودبن نورالدین

آخری شعر میں مسعود بن نور الدین کا نام ہے، لیکن ان اشعار میں بھی شیرانی صاحب کے خیال کے مطابق نور الدین ارسلان نہیں، بلکہ اس کے بیٹے مسعود کا نام ہے، اور چونکہ 'قاہر' کا لقب بھی موجود ہے، اس بنا پر ڈاکٹر ریو کو بھی مغالطہ ہو گیا کہ یہ الملک القاہر عزالدین مسعود ثانی بن نور الدین ارسلان ہے، چنانچہ خمسۂ نظامی کے ایک مخطوطہ

(۱) - رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۲۶ء ص ۳۰ -
(۲) - فہرست جلد ۲ ص ۵۶۹ -

۵۸۷ھ میں اقبال نامہ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ریو رقمطراز ہے :

'شروع میں ملک قاہر عزالدین مسعود بن نور الدین والی موصل کے نام پر انتساب ہے ، جو اس طرح شروع ہوتا :

طرفدار موصل بمردانگی الخ

الملک القاہر آخر رجب ۶۰۷ھ میں اپنے باپ کا جا نشین ہوا۔ (کامل ابن اثیرج ۱۲ ص ۱۹۳) اگر یہ انتساب واقعی نظامی کا لکھا ہوا ہے ، تو اس سے معلوم ہوگا کہ نظامی اس تاریخ کے بعد تک بھی زندہ رہے ہیں ، اور آخر میں بھی ملک عزالدین مسعود کی مدح پائی جاتی ہے ' (۱)
لیکن اس سے پیشتر ریو خود ہی لکھ چکا ہے کہ :

'نظامی کی وفات کے متعلق اس تمہید (بنام عزالدین مسعود) سے شبہ پیدا ہوتا ہے ، کہ یہ تمہید بہت سے قدیم مخطوطات نیز مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہے ، اور سب سے بڑھ کر اشتباہ انگیز امر تو یہ ہے ، کہ بغور معائنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے ، کہ سوائے ناموں کے یہ مدح تمام تر سکندر نامہ حصہ اول سے (جو ملک نصرۃ الدین کے نام پر معنون ہے ،) نقل کر دی گئی ہے ۔'

عزالدین بن قطب الدین مودود اپنے بھائی سیف الدین غازی کی وفات کے بعد ۵۷۶ھ میں موصل کا فرمانروا ہوا ، اور شعبان ۵۸۹ھ میں رحلت کر گیا ، (دیکھو ابن خلکان اور کامل بن اثیرج ۱۲ ص ۶۲) ڈاکٹر باخر کا خیال ہے ، کہ یہ تتمہ سکندر نامہ کی کسی اگلی اشاعت کا ٹکڑا ہے ، چنانچہ ایک اتفاقی حوالے سے جس میں نظامی کے صاحبزادہ کی عمر ۱۷ سال بتائی گئی ہے :

شدہ ہفدہ سالہ بدینسان کہ ہست

ڈاکٹر باخر نے قیاس کیا ہے کہ چونکہ لیلیٰ مجنوں کی تصنیف (۵۸۴ھ) کے وقت نظامی کے صاحبزادے کی عمر ۱۴ سال کی تھی اس لیے یہ تتمہ اس کے تین سال کے بعد یعنی ۵۸۷ھ میں لکھا گیا ہوگا ۔(۲)

---

(۱) ۔ ضمیمہ فہرست مخطوطات ریو ص ۱۵۴ تا ۱۵۵ ۔

(۲) ۔ فہرست مخطوطات جلد دوم ص ۵۶۹ ۔

بہر کیف اگر یہ تہدیہ صحیح ہو تو بھی یہاں عزالدین مسعود سے
مراد پوتا نہیں ، بلکہ دادا ہے ، جیسا کہ آخری مصرعے میں اس کی
کنیت ابوالفتح(۱) اس پر صریحاً دلالت کر رہی ہے، اس لیے باخر کا یہ خیال
صحیح ہے ، کہ سکندر نامہ کی اگلی اشاعت اسی کے نام سے منسوب کی گئی
ہے ، پروفیسر براؤن کے قول سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے :

'سکندر نامہ پہلے عزالدین مسعود (اول) اتابک موصل کے نام
معنون کیا گیا اور بعد میں نظر ثانی کے بعد اس کی دوسری اشاعت
نصرۃالدین ابوبکر بشکین کے نام منسوب کی گئی جو اپنے چچا
قزل ارسلان کے بعد ۵۸۷ھ میں اتابک آذر بائجان کی حیثیت سے
اُس کا جا نشین ہوا -' (۲)

مندرجہ بالا بیانات کی بنا پر پروفیسر شیرانی کے اس خیال کی کماحقہ
تردید ہو جاتی ہے ، کہ نظامی نے ۶۰۷ھ کے بعد اسی کتاب کو نورالدین
ارسلان کے نام سے منسوب کیا۔

---

(۱)- ابن خلکان جلد دوم ص ۹۳ -
(۲)- لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم ص ۴۰۲ -

نظامی گنجوی کی قبر

ایران کے سرآمد شعرا حضرت شیخ نظامی گنجوی شہر گنجہ میں پیدا ہوے اور وھیں مدفون ہوے۔ انھوں نے سکندر نامہ میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ان کی قبر نیکوں کی زیارت گاہ ہو:

نگویم بداندیش را نیز بد
کزان گفتہ باشم بداندیش خود
بدین نیکی آرند بر من فزود
زنیکان و از نکینامان درود
وزین حال گرنیز گزدان شوم
زیارتگہ نیک مردان شوم

ان کی یہ دعا مقبول ہوئی، چنانچہ صاحب آتشکدہ کا بیان ہے کہ:

'شیخ در گنجہ مدفون است و مزار کثیرالانوارش حال نیز محل زیارت اکابر و اعاظم آن دیارمی باشد۔'

اس کا ثبوت ذیل کے واقعات سے بھی ملتا ہے:

۱۔ اسکندر منشی نے اپنی تاریخ میں(۲) لکھا ہے کہ ۱۰۱۴ھ میں شاہ عباس صفوی کی فوجیں جب گنجہ کے قریب پہنچیں تو شیخ نظامی کی تربت پر پڑاؤ ڈالا اور وھیں بروز شنبہ ۱۵ ذوالقعدہ ۱۰۱۴ھ (۲۵ مارچ ۱۶۰۶ء) کو جشن نوروز منایا۔

(۲) اسی طرح شاہ ناصرالدین قاچار نے اپنے سفرنامے (۳) میں لکھا ہے کہ سفر یورپ سے واپسی کے بعد الزابیتھ پول (گنجہ) جاتے ہوے انھوں

---

(۱)۔ آتشکدہ ص ۲۳۲ طبع بمبئی (۲) تاریخ عالم آرائے عباسی ص ۳۹۸ مطبوعہ طہران، (۳) سفر نامہ شاہ ایران ص ۱۶۷ مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۶ء

نے شیخ نظامی کے مقبرے کی زیارت کی جو شہر سے آدھا میل دور بر سر راہ واقع ہے اور غایت معمولی درجے کا اور پکی اینٹوں سے تعمیر کیا ہوا نہایت شکستہ اور منہدم حالت میں ہے ۔

نظامی کی قبر اس وقت کس جگہ اور کیسی حالت میں ہے، اس کے متعلق روس کی انجمن آثارقدیمہ کے رسالہ 'زپسکی، جلد ۲۱ صفحہ ۳۵ - ۳۴، میں روسی مستشرق بارٹولڈ (BARTOLD) کے قلم سے ایک مضمون روسی زبان میں شائع ہوا ہے ۔ رسالے کا پورا نمبر تو نہ مل سکا مگر اس اصل روسی مضمون کی مطبوعہ نقل مع عکس مزار نظامی ایک جرمنی کتب فروش کی بدولت ہم کو دستیاب ہوئی ہے اور روسی زبان سے عدم واقفیت کی دشواری کو ہمارے کرم فرما مشہور روسی مستشرق پروفیسر ڈبلیو آئی ونوو (W. I. Vanov) نے حل کردیا ہے جو اسماعیلیات، کے ماہر خصوصی ہیں۔ چنانچہ اسی مضمون کی بنا پر ہم قبر نظامی کے متعلق بعض معلومات پیش کرتے ہیں ۔

شہر طفلس کے عجائب خانہ' کوہ قاف (Coucostus Inuseum) کے ناظم اے، کازنکو کی اطلاعات کے مطابق قبر نظامی کے کھنڈر مقامی طور پر شیخ نظامی کے نام سے مشہور ہیں اور الزابیتھپول (گنجہ) سے (۱) جو تمامتر روسی حکومت کے ماتحت ہے چار Vreste (۲) کی مسافت پر اس قدیم طریق البرید (Old Pool Road) کے قریب واقع ہیں جو دلمتلو (Dalmitlu) کے اسٹیشن کو جاتا ہے۔

مرزا محمد آخوندوف (گنجوی) نے ایک رسالہ بعنوان 'شیخ نظامی آذر بائجانی، ترکی زبان میں لکھا تھا جو ۱۹۰۹ء میں گنجہ یا الزابیتھ پول سے شائع ہوا تھا، مؤلف نے اس کو یورپی ماخذ سے مرتب کیا ہے اور قبر نظامی کا عکس بھی اس میں دیا ہے۔ اس رسالے کے مطابق قبر نظامی در اصل قدیم شہر (گنجہ) میں واقع ہے ۔ مؤلف اس قبر کی شکستہ حالت کا ذکر کرتے ہوئے عالم اسلامی کا مقابلہ یورپ سے کرتا ہے، جہاں اہل علم کی بہت قدر کی جاتی ہے، وہ لکھتا ہے :

---

(۱) ۔ مشرقی جانب (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۲ ص ۱۳۰)۔

(۲) تقریباً ۲-۳ میل

'شعرائے اسلام، سعدی، حافظ، فضولی، خاقانی، قاآنی وغیرہ کے مقابر اس وقت شکستہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور کسی سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ان کی مرمت کرائے'۔(۱)

مؤلف نے اس رسالے کی آمدنی تمامتر قبر نظامی کی مرمت کے لیے وقف کر دی ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کے بعد قبر نظامی کی مرمت کسی نے کرائی یا نہیں۔ 'واللہ درمن قال':

نہ گورسکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

۱۳۲۰ھ میں قبر نظامی کی قابل افسوس کس مپرسی کی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک ایرانی اہل قلم نے لکھا ہے کہ:

'واز قرار تقریر بعضے کہ چند سال قبل دیدہ اند محوطہ مقبرہ این حکیم بزرگ جائے سوران وخراں شدہ و باوجوداحترامی کہ بزرگان فرنگ از آثار حکمای ہر ملت و طائفہ دارند جای تعجب است کہ چرا امنای دولت معظمہ، امپرا طوریہ در تعمیر و تنظیف مقبرہ این بزرگوار اہمال کردہ بمعرض عین فرمودہ اند، امید دارم بعدہ ملتفت این نکتہ شدہ انچہ لازمہ احترام ونگاہداری ہمیشہ آنجناب است معمولی دارند'۔(۲)

---

(۱) شاید مؤلف کو سعدی اور حافظ کے مقبروں کا صحیح علم نہیں ہے کہ وہ اس وقت بہت آباد اور اچھی حالت میں ہیں، اورشیراز میں سعدیہ اور حافظیہ کے نام سے مشہور ہیں۔

(۲) دیباچۂ خمسۂ نظامی، مطبوعہ بمبئی ص ۴۔

نوٹ: آخر میں مصنف نے نشان لگا کر حاشیے میں لکھا ہے، (قبر کی تعمیر جدید) غالباً کچھ اضافہ مقصود تھا، جس کی ان کو مہلت نہ ملی (مرتب)۔

دیوانِ نظامی کے قلمی نسخے

نسخوں کی قلت:

نظامی کے دیوان کے صرف چند نسخے اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں، حالانکہ دنیا کا کوئی مشرقی کتبخانہ خمسہ نظامی کے متعدد قلمی نسخوں سے خالی نہیں ہے، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظامی کا کلام ان کے زمانے کی روش سے الگ تھا، جس کی وجہ سے وہ مقبول عام ہوکر شہرت دوام نہ حاصل کرسکا ۔ اس میں شک نہیں کہ نظامی کو مثنوی گو کی حیثیت سے تمام شعرائے ایران پر تفوق حاصل ہے اور اس میدان سخن میں سوائے فردوسی کے کوئی ان کا حریف مقابل نظر نہیں آتا، لیکن ان کا رنگ تغزل اس قدر پھیکا رہا کہ لوگوں کو ان کے کلام کی طرف زیادہ رغبت نہیں ہوئی ۔ ان کے قصائد اور غزلیات وغیرہ جو دیوانوں کے موجودہ نسخوں میں پائے جاتے ہیں، نیز ان کے منتخب اشعار جو کتب تذکرہ میں منقول ہیں ان کا رنگ زیادہ تر متصوفانہ اور واعظانہ ہے ۔قصیدہ نویسی کا فن جس میں ان کے معاصرین خاقانی ابوالعلا، ظہیر فاریابی، وغیرہ کو یدطولیٰ حاصل تھا اس میں بھی نظامی کے ہاں وہی خشک پندوموعظمت کا انداز ہے، غرض کہ ان کے کلام میں وہ چاشنیٔ سخن نہیں پائی جاتی جو خسرو، سعدی و حافظ کا طغرائے امتیاز ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر ان کی مثنویوں کی قدر و منزلت اور ان کو بقائے دوام نصیب ہوئی وہ ان کے دیوان کو حاصل نہیں ہو سکی ۔

رسالۂ معارف بابت فروری ۱۹۲۸ء میں میرا ایک مضمون 'دیوان نظامی' کے عنوان سے شایع ہو چکا ہے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں دیوان نظامی کے قلمی نسخوں کا ذکر کیا تھا جو یورپ کے کتب خانوں بوڈلین و آکسفرڈ اور پروشین نیشنل لائبریری (برلن) میں موجود ہیں ۔ ان نسخوں کے علاوہ ہندوستان میں بھی دو اور قلمی نسخوں کا پتا لگا ہے جو کلکتہ کی امپیریل لائبریری اور ریاست رامپور کے سرکاری

کتب خانے میں موجود ھیں۔ گویا اس وقت تک دیوان مذکور کے کل پانچ نسخے معلوم ھوے ھیں، ان نسخوں کا حال ذیل میں درج کیا جاتا ھے:

بوڈلین کے نسخے: (۱)

اس کتب خانے میں دو نسخے نمبر ۶۱۸ اور ۶۹۹ پر موجود ھیں:

۱ - ۶۱۸ کا ذکر ڈاکٹر ایتھے نے کتب خانہ مذکور کی فہرست میں اس طرح کیا ھے:

'انتخاب منظومات صغیرہ منسوب به نظامی۔'

یہ اس نسخے سے پوری مطابقت رکھتا ھے، جس کا ذکر ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست (ص ۵۲۳) میں کیا ھے۔ شروع میں قصائد ھیں، دیوان کا مطلع یہ ھے:-

ہر کہ از روی خرد روی بہ یزدان آرد
لطف یزدانش همی تحفه غفران آرد

پھر غزلیات ورق ۱۳ سے ردیف وار شروع ھوتی ھیں۔ پہلا شعر یہ ھے:

روزے بکرم گہاں رفتن پیادہ
ابلیس پیش آمد موسیٰ کلیم

خاتمے کا ورق غائب ھے، یہ نسخہ ۵۴ اوراق پر بخط نستعلیق لکھا ھوا ھے۔ ھر صفحے میں ۱۴ سطریں ھیں۔ سائز ساڑھے چھ انچ ھے۔

۲ - نمبر ۶۱۹ - شروع میں قصائد ھیں۔ چودھویں ورق سے غزلیات ردیف وار درج ھیں۔ دیوان کا مطلع حسب سابق اس کے بعد ورق ۳۴ پر رباعیات ھیں، پہلا شعر یہ ھے:

چوں تاک نطاقے شکر آب آلودش
در نرگس پر خمار خواب آلودش

سنہ کتابت مذکور نہیں ھے، ۴۷ ورق اور ھر صفحے میں ۱۳ سطریں ھیں۔ نستعلیق خط میں لکھا ھوا ھے۔ سائز ۸×۵½ انچ -

۳ - برلین کا نسخہ:

برلین کی پروشین نیشنل لائبریری میں ایک نسخہ دیوان نظامی کا نمبر ۳ - ۶۶۲ پر موجود ھے جو ڈاکٹر اسپرنگر کے ذخیرۂ کتب میں شامل ھے، (۲)

---

(۱) - ان نسخوں کا حال مجھے کتب خانۂ مذکورہ کے ناظم صاحب نے لکھ بھیجا ھے، نیز انھوں نے دونوں نسخوں کا عکس مہیا کرنے کا وعدہ بھی کیا ھے، جس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ھوں، (اختر)۔

(۲) دیکھو اسپرنگر کی فہرست کتب ببلو تھیکا اورئینٹیلیس ص ۸۲

نستعلیق خوش خط لکھا ہوا ۴۳ اوراق پر مشتمل ہے، شروع میں نہ کوئی دیباچہ ہے نہ آخر میں کوئی خاتمہ۔ حسب دستور پہلے قصائد ہیں پھر غزلیات اور رباعیات۔ پروفیسر ہوٹسما نے اس نسخے کا مطالعہ کیا ہے، چنانچہ ان کا بیان ہے کہ اس نسخے میں وہ اشعار نہیں پائے جاتے جو عوفی نے نقل کیے ہیں، البتہ جامی کے منقولہ اشعار ورق ۲۲ پر پائے جاتے ہیں(۱)

۴ - بوہار کا نسخہ:

یہ نسخہ ناتمام کتب خانہ بوہار میں موجود ہے، جو فی الحال کلکتہ کی امپیریل لائبریری میں منتقل ہو گیا ہے۔ ۲۹ اوراق پر نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے، حاشیے پر مطلا اور رنگین جدولیں ہیں دیوان کا مطلع حسب سابق ہے۔ اس نسخے میں اوراق کی ترتیب برابر نہیں ہے، اس پر کئی تحریرات پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں یہ نسخہ مولوی محمد مظہر ابن مولوی غلام سبحان خان بہادر قاضی القضاۃ بنگال ابن مولوی محمد واجد ساکن پنڈوا ہگلی کے پاس تھا تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔(۲)

۵ - رامپور کا نسخہ:

تقریباً پانچ جز و کا ناقص دیوان ہے، اس میں قصائد اور غزلیات کے علاوہ ۲۳ رباعیات ہیں۔ نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ مطلع دیوان حسب سابق سر ورق پر مسٹر بلاک مین (پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ) کے دستخط ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نسخے کا مطالعہ کیا تھا۔ اس میں کتابت کی غلطیاں بہت پائی جاتی ہیں۔(۳)

۶ - نسخہ مطبوعہ آگرہ:

میں نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں ذکر کیا تھا کہ بوڈلین لائبریری میں دیوان کا ایک نسخہ مطبوعہ آگرہ موجود ہے، یہ اس

---

(۱) - اورنٹیل اسٹڈیز (موسوم بہ عجب نامہ) ص ۲۲۵ -

(۳) فہرست کتب خانہ بوہار جلد ۱ ص ۲۲۳ -

(۲) - جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۸ء جلد ۴ - سلسلۂ جدید - ۔

بنا پر تھا کہ نسخہ نمبر ۶۱۸ کے تذکرے کے ضمن میں ایتھے نے اپنی فہرست میں لکھا ہے کہ :

'آگرہ کا نسخہ' دیوان مطبوعہ ۱۲۸۳ھ اس قلمی نسخے سے بالکل مختلف ہے، اس میں وہ قصائد اور غزلیات نہیں پائی جاتیں جو اس نسخے میں موجود ہیں۔'

اس تحریر سے مجھے خیال ہوا تھا کہ غالباً اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ وہاں موجود ہو گا۔ اس کے متعلق میں نے 'کتب خانہ' مذکور کے ناظم سے دریافت کیا، چنانچہ وہ اپنے جواب مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں لکھتے ہیں کہ :

'آپ کو کسی نے اطلاع دی ہے کہ دیوان نظامی کا کوئی مطبوعہ نسخہ ہمارے ہاں موجود ہے، غالباً یہ اس طرح معلوم ہوا ہو گا کہ فہرست نویس نے نسخہ' مطبوعہ آگرہ ۱۲۸۳ھ کا ذکر فہرست میں کیا ہے، لیکن ہمارے کتب خانہ میں کوئی مطبوعہ نسخہ نظامی کا نہیں ہے، ممکن ہے اس کی کوئی جلد خود فہرست نویس کے پاس رہی ہو۔'

اگر ایتھے کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو بہر حال اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ مطبوعہ نسخہ اس کے پاس تھا یا کم از کم اس کی نظر سے گزرا تھا، میں نے اس کے متعلق ہندوستان میں بہت کچھ تلاش و تفتیش کی مگر اب تک پتہ نہیں ملا اور ایک مرتبہ بلاسپور (ریاست رامپور) کے وکیل عدالت چنی لال صاحب صوفی نے مجھ سے دیوان نظامی کے متلعق استفسار کرتے ہوئے اپنے مکتوب مورخہ ۶ فروری ۱۹۱۹ء میں لکھا تھا :

'میرے پاس دیوان حضرت نظامی گنجوی ۳-۴ جزو کا آ گیا تھا اتفاق سے وہ گم ہو گیا اس کا پتہ و نام مطبع یاد نہیں رہا۔'

اس تحریر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دیوان مذکور ضرور چھپا ہو گا، مگر بالفعل وہ نایاب ہے۔

میرے مکرم جناب حافظ احمد علی خان صاحب بہادر نے رامپور والے نسخے کی نقل میرے لیے تیار کرائی ہے، کلکتہ والے نسخے کی کتابت

ہو رہی ہے۔ بوڈلین کے دونوں نسخوں کے فوٹو تیار ہو رہے ہیں، امید ہے کہ برلن کے نسخے کا فوٹو بھی مل جائے گا نسخہ نولکشور کی نقل بھی مل گئی ہے۔ ان کے علاوہ دولت شاہ عوفی، آتش کدہ، مجمع الفصحا وغیرہ میں نظامی کے کلام کے انتخابات موجود ہیں۔ انشاء اللہ ان سب کا مقابلہ کر کے ایک صحیح متن مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔ والامر بیداللہ تعالیٰ و ہو علیٰ کل شئی قدیر۔

۷ - نسخۂ خدیویہ :

کتب خانۂ خدیویہ مصر (بسرائے درب الجمامیز) کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں اس نسخے کے متعلق لکھا ہے:

'دیوان نظامی تالیف المولیٰ نظام الدین ابی محمد جمال الدین یوسف بن مؤید الگنجوی الاریسی المتوفی سنۃ ۵۹۷ اولہ : یااشرف البریہ یا سیدی الوراء (الخ) بقلم تعلیق بخط بیر احمد بن اسکندر تم تحریرہ فی سنہ ۹۲۳ و ہو باللغۃ الترکیتہ - ،(۱)

اس تحریر سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ دیوان انہی نامور شاعر نظامی کا ہے جو گنجوی کہلاتے ہیں، وہاں یہ امر بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان میں ہے، اگر واقعی یہ دیوان شیخ نظامی کا ہے تو شائقین ادب فارسی کے لیے یہ ایک نیا انکشاف ہو گا کہ نظامی ترکی زبان بھی جانتے تھے، بلکہ اس میں شعر کہتے تھے، لیکن یہ آج تک ان کے کسی سوانح نگار یا تذکرہ نویس نے نہیں لکھا اور نہ کہیں نظامی کے کلام میں اندرونی طور پر اس کی کوئی شہادت ملتی ہے، علاوہ ازیں آغاز دیوان کے عربی شعر سے، جو عربی قصیدۂ نعتیہ کا مطلع معلوم ہوتا ہے، یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ اس دیوان میں ان کے عربی اشعار بھی ہوں گے، اس قصیدے کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

یا اشرف البریہ یاسیدالوریٰ

(۱) - فہرست الکتب الفارسیۃ والجاویۃ المحفوظہ بکتب خانۂ الخدیویۃ المصریہ ص ۳۸۹-

هم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا یہ دیوان فارسی زبان میں ہے یا ترکی میں، اپنے ایک کرم فرما مصر کے عیسائی کتب فروش الیان سرکیس کو لکھا تھا کہ وہ اس دیوان کے متعلق ضروری معلومات سے ہم کو آگاہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے جواب میں لکھا ہے کہ:

'یہ کتاب فارسی زبان میں ہے، ترکی میں نہیں ہے' اس دیوان کے ۵۰ صفحے الٹنے کے بعد اشعار ذیل ملتے ہیں:

نظامی نظمکی کورسد نظامی گنجه
اوتردی کنج لحدون که تم فیک مقال
و کل براهل معانی قتنده دون بیج
محدث تمم ایدر بو حال اهل مقال
طناب چتر سخن وا مکن بده اطناب
که تابخاطر عاطر رسد گزند و ملال

ظاہر ہے کہ ان میں سے پہلے دو شعر ترکی زبان میں اور تیسرا شعر فارسی میں ہے، غالباً ہمارے کاتب کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوان میں صرف چند اشعار ترکی زبان میں پائے جاتے ہیں لیکن اگر تمام دیوان اسی زبان میں ہو تو پھر صاحب فہرست کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ دیوان ترکی زبان میں ہے، ہم نے موجودہ مخطوطات میں ان اشعار کی تلاش کی مگر بے سود۔ ہرمن ایتھے نے اپنی فہرست فارسی مخطوطات موجودہ کتب خانہ باولی(۱) میں ایک ترکی شاعر نظامی کے ایک مختصر مجموعۂ غزلیات کا ذکر کیا ہے جس نے ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر اس نے نظامی کے پہلے نعتیہ قصیدے کا وہ مصرعہ نقل کیا ہے جو اوپر درج ہو چکا ہے۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہ دیوان نظامی تخلص کے ترکی شاعر کا ہے جس کو نظامی ثانی کہا جاتا ہے۔ نظامی کے دیوان کے مختلف مجموعے ہیں، چنانچہ عوفی نے اپنے تذکرے میں جو غزلیں نظامی کی نقل کی ہیں وہ بھی ہمارے ان مخطوطات میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی طرح ہرمن ایتھے نے بھی فہرست مخطوطات فارسی (بوڈلین لائبریری) میں لکھا ہے کہ آگرہ کا مطبوعہ (۱۲۸۳ھ) نسخۂ دیوان بوڈلین کے قلمی نسخے سے بالکل مختلف ہے، اس میں وہ قصائد

---

(۱) ص ۱۲۱۱۔

اور غزلیات نہیں پائی جاتیں جو اس نسخے میں موجود ہیں، اس سے دولت شاہ اور لطف علی آذر کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ خمسہ کے علاوہ نظامی کے قصائد و غزلیات، قطعات و رباعیات کے بیس ہزار اشعار ہیں۔ اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حال میں ادارۂ مجلہ ارمغان (تہران) خمسہ نظامی کا ایک صحیح اڈیشن شائع کر رہا ہے (۱) اور اس کی عنقریب شائع ہونے والی پہلی جلد شیخ کی مثنوی مخزن اسرار کے علاوہ ان کے دیوان پر مشتمل ہو گی جس کے اشعار کی مجموعی تعداد ۴ ہزار ہو گی۔ حالانکہ موجودہ مخطوطات میں اشعار کی مجموعی تعداد بارہ تیرہ سو سے زائد نہیں ہے۔ (دیکھو ص ۱۵۴ در ذکر نسخہ مطبوعہ آگرہ)

۸ - نسخۂ نولکشور:

یہ نسخہ مطبع نولکشور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دیوان کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔:

'دیوان حضرت اولیای نظامی گنجوی قدس‌الله سره' در دارالخلافت شاهجهان آباد به اشتیاق تمام به سرعت بتاریخ دوازدهم ماه اگست ۱۸۳۵ء روز دوشنبه بخط پنڈت دهرم نرائن اختتام پزیرفت۔'
(دیکھو ص ۱۵٦ ' در ذکر نسخۂ خدیویہ)

---

(۱) ۔ وحید دستگیری مدیر مجلہ ارمغان نے دیوان نظامی شائع کر دیا ہے۔ ہم نے مختلف نسخوں سے دیوان نظامی مرتب کیا تھا اس کو وحید دستگیری کی استدعا پر ہم نے تہران بھیج دیا تھا۔ چنانچہ صاحب موصوف نے اپنے مرتبہ دیوان نظامی میں اس کو شریک کر لیا اور مقدمے میں انھوں نے ہمارے نسخے کا ذکر کیا ہے۔

دیوانِ نظامی گنجوی

تمام تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ مثنویات خمسہ کے علاوہ نظامی کا اور کلام بھی تھا جو آج ناپید ہے:

۱ - دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں ایک غزل نقل کی ہے جس میں نظامی کا تخلص بھی موجود ہے اور لکھا ہے کہ ان کے قصائد، غزلیات، موشحات اور صنائع وغیرہ کے بیس ہزار اشعار ہیں (۱)

۲ - عوفی کا بیان ہے کہ:

'بجز ان چند مثنویوں کے نظامی نے بہت کم شعر لکھے ہیں، نیشا پور میں میں نے ایک فاضل شخص کی زبانی ان کی ایک غزل سنی تھی۔' (۲)

اس کے بعد عوفی نے پانچ پانچ شعروں کی تین غزلیں درج کی ہیں، جن میں سے آخری غزل میں نظامی نے اپنے فرزند دلبند کا ماتم کیا ہے۔

۳ - حاجی خلیفہ نے 'دیوان نظامی' کا ذکر کیا ہے:

'دیوان نظامی فارسی للنظامی الگنجی صاحب الخمسۃ الخ' (۳)

۴ - لطف علی آذر نے بھی نظامی کے قصائد اور غزلیات کے منتخب اور متفرق اشعار نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ نظامی کے کلام میں قصائد، غزلیات اور رباعیات کے کل بیس ہزار اشعار ہیں جو بالفعل نایاب ہیں۔ (۴)

۵ - رضا قلی ہدایت نے نظامی کے تین قصائد (ایک ۴۲ شعر کا، دوسرا ۱۶ شعر کا، اور تیسرا ۳۷ شعر کا) اور تین تین چار چار شعروں کی ۹ غزلیں مع ایک رباعی کے نقل کی ہیں۔ (۵)

---

(۱) - تذکرۂ شعرا ص ۱۲۶، مطبوعہ یورپ (۲) لباب الالباب ج ۲ ص ۳۹۷ طبع یورپ (۳) کشف الظنون جلد ۱ ص ۵۲۴، ۵۲۵ طبع آستانہ۔ (۴) آتشکدہ ص ۲۴۲ مطبوعہ بمبئی (۵) مجمع الفصحا ج ۱ ص ۶۳۷ طبع ایران۔

۶ - ملا بدایونی (۱) نے نظیری نیشاپوری کے حالات میں لکھا ھے
کہ اس نے شیخ نظامی کے قصیدے کے تتبع میں جس کا مطلع یہ ھے :

ملک‌الملوک فضلم بہ فضیلت معانی
ز می و زمان گرفتہ بمثال آسمانی

ایک قصیدہ لکھا ھے جس کا مطلع یہ ھے :

ز ھنر بخود نگنجم چو بخم مئے معانی
بدرد لباس برتن چو بجو شدم معانی (۲)

اس واقعے سے بھی اس بات کی تائید ھوتی ھے کہ مثنویات کے علاوہ نظامی کا اور کلام ھے،

۷ - حضرت‌شمس‌الدین‌تبریزی نے اپنی ایک غزل میں نظامی کا ایک مصرعہ تضمین کیا ہے :

نظیر آنکہ نظامی بہ نظم می گوید
جفا مکن کہ مرا طاقت جفاے تونیست

اسی طرح حضرت شاہ نعمت اللہ (۱۰۷۷ھ) نے بھی نظامی کے اسی قصیدے کے تتبع میں ایک (۳۴) شعر کا قصیدہ لکھا ھے، اس میں فخریہ طور پر فرماتے ھیں :

بجہان کجا نظامی کہ بہ طیبتش بگویم
کہ من این ترانہ گفتم تو بگو اگر توانی (۳)

۸ - مولانا جامی نے نظامی کی ایک غزل (جس کو دولت شاہ نے غالباً انہیں کی کتاب سے نقل کیا ھے) درج کی ھے، اور لکھا ھے کہ نظامی سے بہت کم اشعار منقول ھیں۔(۴)

۹ - زمانۂ حال کے محققین میں علامہ شبلی اور آزاد (مرحومین) اس کے قائل ھیں اور مذکورہ بالا بیانات کی تائید کرتے ھیں۔(۵)

---

(۱) منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳۷۵ مطبوعہ کلکتہ۔
(۲)۔ کلیات نظیری ص ۳۲۳ طبع لکھنؤ ۱۲۹۱ھ (۳)۔ تذکرہ مراۃ‌الخیال شیر علی خان لودی ص ۱۴۵ تا ۱۲۷ مطبوعہ بمبئی۔
(۴) بہارستان، (۵)۔ دیکھو شعرالعجم ج ا ص ۲۹۸ - ۳۰۱، نگارستان فارس ص ۶۶ -

۱۰ - مشہور یورپین مستشرق ڈاکٹر ایتھے (ETHE) جس نے انسائیکلوپیڈیا میں نظامی پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے،نظامی کے مزید کلام کی شہادت ان الفاظ میں دیتا ہے :

'نظامی نے مثنوی شیرین خسرو دربار شاہی میں پیش کی، اس کے بعد دو سال تک ان کی ذہانت بیکار نہیں رہی اور بالآخر ۵۸۴ھ (۱۱۸۸ء) میں انھوں نے اپنا دیوان مرتب کیا، یہ (دیوان) قصائد اور غزلیات کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر اخلاقی اور موعظت آمیز ہیں، ان کی تعداد بیس ہزار بتائی گئی ہے' حالانکہ اس (دیوان) کے چند نسخوں میں جو کہ ہم کو دستیاب ہوے ہیں ایک قلیل تعداد اشعار کی موجود ہے' (۱)

۱۱ - ان بیرونی شہادتوں کے علاوہ خمسہ میں خود نظامی کے بعض اشعار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے قصائد اور غزلیں لکھی تھیں، بلکہ اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا :

(الف) مخزن اسرار میں جو ان کی پہلی تصنیف ہے، اپنے کلام کی تعریف کرتے ہوے فرماتے ہیں -

شعر نظامی شکر افشان شدہ

درد غزالان غزلخوان شدہ (۲)

(ب) شیرین خسرو کے شروع میں طغرل ارسلان کی مدح موجود ہے، اس میں نظامی نے طغرل کو اس کے وزیر اتابک (محمد جہان پہلوان) کی طرف مخاطب کرا کے اپنی قدر دانی کے الفاظ ممدوح کی زبان سے ادا کرائے ہیں، چنانچہ طغرل نظامی کی تعریف کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ایسے زبردست اور نامور شاعر کو ہم نے اپنی جودو بخشش سے کبھی نہیں نوازا' حالانکہ :

ستی و مہستی را بر غزلہاش

شبے صد گنج بخشم بر مثلہا ش (۳)

ہم صرف اس کی غزلیں اور پند آمیز مثلیں گانے پر 'ستی' اور 'مہستی' (گانیوالیوں) کو ایک رات میں ڈھیروں انعام و اکرام سے مالا مال کر

---

(۱) - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۷ ص ۵۲۲ طبع نہم -

(۲) - خمسہ' نظامی ص ۱۸ مطبوعہ بمبئی ۱۳۲۸ھ -

(۳) - ایضا ص ۴۵ -

دیتے ھیں۔

(ج) قزل ارسلان کے دربار میں جب مثنوی شیرین خسرو پیش کرنے گئے ھیں تو قصیدہ لکھ کر لے گئے ھیں، دربار میں پہنچے تو ارباب نشاط ان ھی کی غزلیں گا رہے تھے:

غزلہائے نظامی را غزالان

زدہ بر زخمہ ھائے چنگ نالان (۱)

پزیرائی کے بعد انھوں نے قصیدہ سنانا چاھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ شعرا اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے، بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے جو ھمیشہ ان کے ساتھ رھتا تھا اور اس کو راوی کہتے تھے، (۲) چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔:

در آمد راوی و بر خواند چون در

ثنائے کان بساط از گنج شد پر

یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ھو جاتا تھا اور قصیدے کے ختم ھونے تک کھڑا رھتا تھا، نظامی نے بھی اس قاعدے کو بجا لانا چاھا، لیکن قزل ارسلان نے قسم دلا کر منع کیا۔:(۳)

جو برپا ایستادم گفت بنشین

بسو گندم نشاند ایں منزلت بین (۴)

(د) لیلی مجنوں میں حاسد کی شکایت کرتے ھوئے فرماتے ھیں۔:

گر پیشہ کنم غزل سرائی

او پیش نہد دغل درائی

گر ساز کنم قصائد چست

او پیش نہد قلائد سست (۵)

(ھ) اسی مثنوی کے شروع میں لکھتے ھیں کہ ایک دن صبح کے وقت جبکہ وہ اپنا "دیوان، دیکھ رھے تھے، قاصد فرمان شاھی لے کر پہنچا کہ قصہ لیلی مجنوں نظم کرو۔:

روزی بہ مبارکی و شادی بودم بہ نشاط کیقبادی

---

(۱) ۔ خمسۂ نظامی ص ۱۹۱ مطبوعہ بمبئی ۱۳۲۸ھ (۲)شعر العجم ج ۱ ص ۲۹۲ طبع معارف۔ (۳) ۔ شعر العجم۔

(۴) ۔ خمسہ ص ۱۹۲ ۔ (۵) ۔ ایضاً ص ۲۰۷ ۔

ابروی هلالیم کشاده
دیوان نظامیم نهاده
آئینهٔ بخت پیش رویم
اقبال بشانه کرده مویم
صبح از گل سرخ دسته می کرد
روزم بنفس خجسته می کرد
پروانهٔ دل چراغ دردست
من بلبل باغ و راغ در دست
بر اوج سخن علم کشیده
در درج هنر قلم کشیده
منقار قلم به لعل سفتن
دراج زبان به نکته گفتن
در حال رسید قاصد از راه
آورد مثال حضرت شاہ (۱)

جرمن مستشرق ڈاکٹر ولہم باخر(Bacher) نے، جس نے نظامی کے حالات میں ایک محققانہ کتاب لکھی ہے، اسی شعر سے استشہاد کیا ہے، کہ نظامی نے لیلیٰ مجنوں کی تصنیف (۵۸۴ھ) کے ساتھ ہی ساتھ اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا ۔(۲)

ان تمام شواهد کے باوجود پروفیسربراؤن کو اس بات کے ماننے میں تامل تھا کہ مثنویات کے علاوہ نظامی کا اور کلام بھی ہے۔ چنانچہ لکھتے ھیں :

"مگر یہ یاد رکھنا چاھیے کہ اسی تخلص کے کئی شعرا گذرے ھیں، جنھیں ممکن ہے کہ ھمارے اس غلط نگار تذکرہ نویس نے نظامی سمجھ کر لکھ دیا ھو اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کا کوئی دیوان تھاتویہ بھی صحیح ہے کہ وہ مدت مدید سے بالکل معدوم اور نایاب ہے۔" (۳)

اس میں شک نہیں کہ اسی تخلص کے تین شعرا خود نظامی کے زمانے میں موجود تھے (۴) لیکن صرف یہی دلیل اس بات کو نہ تسلیم کرنے کے لیے کافی نہیں ھو سکتی، پھر براؤن کا یہ ریمارک تمام تر دولت شاہ کے

(۱) خمسہ ص ۲۰۲ (۲) لٹریری ہسٹری آف پرشیا ج ۲ ص ۴۰۲ ۔
(۳) ایضا ۔ (۴) چہار مقالہ نظامی عروضی سمر قندی، آخر مقالهٔ دوم ۔

متعلق ہے، اور یہ تو ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ یہ تذکرہ نویس بہت غیر محتاط ہے، اور اکثر غلط و مبالغہ آمیز باتیں لکھ جاتا ہے لیکن اس سے قطع نظر کر کے اور جومستند شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں وہ اس قدر معتبر اور ناقابل تردید ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اگر واقعی نظامی نے اپنا کوئی دیوان مرتب کیا تھا تو کیوں اس کے کسی قلمی نسخے کا پتہ نہیں چلتا؟ اگرچہ مذکورہ بالا بیانات سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کسی تذکرہ نویس نے ان کا دیوان دیکھا تھا، تاہم انہوں نے نظامی کا جو کلام نقل کیا ہے بہر حال وہ دیوان کے کسی نسخے ہی سے نقل کیا ہو گا جو (بقول ان مصنفین کے) بعد میں ناپید ہو گیا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہندوستان کے کتب خانوں میں 'دیوان نظامی' کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے' البتہ آغا احمد علی صاحب (مرحوم) کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا جس کی نسبت وہ تحریر فرماتے ہیں :

'نزد بندہ احمد یک موجز دیوان شیخ نظامی گنجوی محتوی بر قصائد و غزلیات و رباعیات عارفانہ کہ تخمیناً ہمگی پانصد بیت خواہد بود سوجود است و کتابخانہ ام ازو شرفی نامحدود۔' (۱)

پروفیسر ہوٹسما (Houtsma) نے دیوان نظامی کے تین نسخے دریافت کیے ہیں' جن میں سے دو آکسفورڈ کی بوڈلین (Bodleian) لائبریری میں موجود ہیں اور تیسرا نسخہ ڈاکٹر اسپرنگر (Sprenger) کے ذخیرۂ کتب میں سے ہے جو اس وقت برلن (جرمنی) کی پروشین نیشنل لائبریری میں (۹۲ - ۶۹۱) موجود ہے، میرے خیال میں غالباً یہ وہی نسخہ ہے جس کا تذکرہ آغا صاحب نے کیا ہے (۲) اس نسخۂ دیوان نظامی کے متعلق

(۱) - ہفت آسمان ص ۷۳ طبع ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ (۲) ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر ایک عرصے تک کلکتہ میں رہ چکے ہیں اور آغا صاحب کے ساتھ مل کر انہوں نے علمی کام بھی کیے ہیں' اسی بنا پر یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ نسخہ انہوں نے آغا صاحب مرحوم سے حاصل کیا ہو گا جو ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد ان کے کتبخانے کے ساتھ نیشنل لائبریری میں منتقل ہو گیا۔

پروفیسر ہوٹسما لکھتا ہے۔:

'اس ایک جلد میں دو کتابیں یعنی دیوان ظہیر فاریابی اور دیوان نظامی مجلد ہیں۔ دیوان نظامی عمدہ نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے، اس کا خط دیوان ظہیر سے بالکل جداگانہ ہے، یہ دیوان ۴۳ اوراق پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی دیباچہ ہے نہ خاتمہ، کلام کی ترتیب حسب دستور یعنی پہلے قصائد پھر غزلیات، پھر رباعیات جن کی تعداد قلیل ہے۔ عوفی اور جامی کے اقوال کی تصدیق ہوتی ہے کہ مثنویات کے علاوہ اشعار ان (نظامی) سے بہت کم منقول ہیں' نیز یہ معلوم ہوتا ہے کہ دولت شاہ کا اشعار کی تعداد بیس ہزار بتانا یقیناً مبالغہ ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ عوفی کے منقول اشعار اس دیوان میں نہیں پائے جاتے' صرف جامی کے بیان کردہ اشعار اس میں ملتے ہیں۔' (۱)

جامی کے منقولہ اشعار کا اس دیوان میں پایا جانا اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ یہ نظامی ہی کا دیوان ہے، چونکہ نظامی نے اپنا دیوان ۵۸۴ھ میں مرتب کیا تھا اور عوفی کے منقولہ اشعار اس تاریخ کے بعد لکھے گئے ہونگے اس لئے وہ اس نسخہ دیوان میں نہیں پائے جاتے' لیکن پروفیسر ہوٹسما کے بیان کے مطابق پہلے قصیدے کا مقطع اس دیوان کے سنہ ترتیب سے مطابق نہیں ہو سکتا، گو تاریخی حیثیت سے اس کا وقوع غیر ممکن نہ ہو۔ وہ شعر یہ ہے۔:

ایں بداں وزن و قوافیست کہ گفتست کمال
ہر نسیمے کہ بمن بوے خراسان آرد (۲)

یعنی یہ قصیدہ نظامی نے کمال کے قصیدے کے تتبع میں لکھا ہے یہاں کمال سے مراد کمال الدین اسمعیل اصفہانی ہی ہو سکتا ہے جس نے ۶۳۵ھ (۱۲۳۷ء) میں نظامی سے ۳۵ برس کے بعد وفات پائی ہے۔ کمال چونکہ خوارزم شاہ تکش کے درباری شعرا میں سے تھا اس لیے اس کو نظامی کا معاصر تسلیم کر لینے میں کوئی دقت نہیں پیش

---

(۱) ۔ اورئینٹل اسٹڈیز موسوم بہ 'عجب نامہ، مرتبہ آرنلڈ و نکلسن ص۲۲۳تا۲۲۷ (۲) المعجم فی معایر اشعار عجم ص ۳۷۸ پر یہ شعر سید اشرف سے اس طرح منسوب کیا گیا ہے:

ہر نسیمے کہ بمن بوی خراسان آرد
چوں دم عیسی در کالبدم جان آرد

آتی، البتہ ترتیب دیوان کی تاریخ سے اس کی مطابقت دشوار ہے، بہر حال اس کے سوا کوئی بات اس دیوان میں ایسی نہیں ہے جو درایۃً عہد نظامی کے حالات و واقعات کے مخالف ہو۔

کتب خانہ باڈلی کی فہرست میں ایک مطبوعہ نسخے کا بھی ذکر ہے جو قلمی نسخے سے بالکل مختلف بتایا گیا ہے، یہ نسخہ ۱۲۸۳ھ میں آگرہ کا چھپا ہوا ہے، اگر واقعی یہ صحیح اور اصلی دیوان ہو (بہت شبہ انگیز ہے) تو غالباً یہ نظامی کے بعد کے کلام کا انتخاب ہو گا ۔

سحابی نجفی

اور
(اس کی رباعیات کے قلمی نسخے)

فارسی شعرا میں رباعیاں لکھنے میں جو لازوال شہرت عمر خیام کو نصیب ہوئی ہے وہ آج تک کسی شاعر کو حاصل نہیں ہوئی۔ خیام سے پہلے اور اس کے بعد بھی یوں تو کئی شعرا نے رباعیاں لکھی ہیں ، لیکن اس صنف نظم میں خیام کا اگر کوئی ہم پلہ ہو سکتا ہے تو وہ سحابی ہے۔ فارسی شعرا میں بحیثیت رباعی گو کے سحابی مسلم مانا گیا ہے۔ چنانچہ صائبؒ کہتا ہے :

غزل گوئی به صائب ختم شد از نکته پردازان
رباعی گر مسلم شد ز موزونان سحابی را

حالات :

سحابی کے حالات سے تذکرہ نویسوں نے بہت کم اعتنا کیا ہے۔ صاحب مرآۃ الخیال نے اس کا اصل وطن نجف اشرف بتایا ہے، مگر اس کے معاصرین امین رازی، تقی کاشی، اور علاء الدولہ قزوینی اسکو استر آباد کا باشندہ بتاتے ہیں۔(۱) تقی اوحدی کا بیان ہے کہ اگرچہ اس کا خاندان اصل میں جرجان سے آیا تھا مگر وہ خود شوستر میں پیدا ہوا تھا۔(۲)

---

(۱) ۔ فہرست مخطوطات فارسی عجائب خانہ لندن از ڈاکٹر ریو جلد ۲ ص ۶۷۲ بحوالہ ہفت اقلیم قلمی ورق ۶۸ھ، فہرست کتبخانہ اودھ ص ۵۰ - ۳۱ -

(۲) ۔ ایضاً بحوالہ ریاض الشعراء قلمی ورق ۲۱۳ -

تیس سال اور بقول بعض چالیس سال، نجف اشرف میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کے روضہ مطہر کی جاروب کشی میں گزار دیے ۔ اور صرف ایک چٹائی اور پانی کے مٹکے پر قناعت کی اور آخر کار اسی مقام محترم میں ۱۰۱۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔(۲) لطف علی آذر نے لکھا ہے کہ آستانہ رضویہ کی مجاورت کے بعد وہ تحصیل علوم اور تہذیب اخلاق میں مشغول ہو گیا تھا ۔(۲)

اس سے زیادہ سحابی کے حالات کا پتا نہیں چلتا ۔

رباعیات :

شعرائے ایران جس طرح مختلف صنف نظم میں مشہور تھے ، اسی طرح سحابی نے بھی فن رباعی گوئی میں خاص شہرت حاصل کر لی ہے ۔ چنانچہ اس کا سرمایۂ سخن تمامتر اس کی رباعیات ہیں جو فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں ۔

سحابی کی کل رباعیات کی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے ، جس میں سے صرف بیس ہزار باقی رہ گئی ہیں ۔(۳) شیر علی خاں لودی نے سحابی کی بارہ ہزار رباعیاں ایک جلد میں دیکھی تھیں ۔ انکا بیان ہے کہ اس کے علاوہ بے شمار رباعیاں دوسرے لوگوں کی لکھی ہوئی ان کے نام سے منسوب کر دی گئی ہیں ۔(۴) رضا قلی ھدایت کو چھ ہزار رباعیاں دستیاب ہوئی تھیں ۔(۵)

شرح رباعیات :

۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ شیخ عنایت اللہ ابن شیخ

---

(۱) ۔ سرو آزاد ص ۱۰ ۔ ۱۴ طبع حیدر آباد ۔
(۲) ۔ آتشکدہ ص ۱۵۷ ۔ ۱۵۶ طبع بمبئی ۔
(۳) ۔ سرو آزاد ص ۱۰ ۔
(۴) ۔ مرآة الخیال ص ۸۴ ۔ ۸۳ ۔
(۵) ۔ مجمع الفصحاء جلد ۲ ص ۲۱ ۔

عبدالکریم بلگرامی (المتوفی ۱۱۲۵ھ) نے سحابی کی ان رباعیات کی جن کا تعلق آیات قرآنی سے ہے، ایک شرح بھی لکھی تھی - (۱)

دیوان :

کہتے ہیں کہ علاوہ رباعیات کے سحابی نے مثنویات اور غزلیات بھی کہی تھیں - اگرچہ شیر علی خان لودی کہتے ہیں کہ سحابی سے کوئی غزل نہیں سنی گئی'(۲) اور ان کا دیوان بھی تھا، جس کو انہوں نے دریا برد کر دیا تھا -

قصہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ وہ کہیں جا رہے تھے، راستے میں ندی تھی - چاہتے تھے کہ پانی کی سطح پر سے گزر جائیں کہ پاؤں پانی میں پڑا - دل میں کہنے لگے، کسی چیز کا تعلق ابھی باقی ہے، اور مجھے اپنے دیوان اشعار کے سوا کسی چیز سے تعلق نہیں ہے، چنانچہ دیوان کو پانی میں ڈال دیا، اور پیک صبا کی طرح سطح آب سے گزر گئے - اسی وجہ سے ان کا کلام ناپید ہو گیا - اور صرف اسی قدر باقی رہ گیا جو لوگوں کی بیاضوں میں لکھا ہوا تھا - (۳) غالباً اس دیوان کے تلف ہو جانے سے ان کی رباعیوں کی بہت بڑی تعداد ضائع ہو گئی -

تذکرہ نویسوں نے ان کی بعض رباعیاں نقل کی ہیں - چنانچہ مراۃ الخیال میں سات، آتشکدہ میں پانچ اور سرو آزاد میں چار رباعیاں درج ہیں علاوہ ازیں صاحب آتشکدہ نے حسب ذیل اشعار نقل کیے ہیں :

زاں رو خط مشکسود برخاست
آتش بنشست و دود برخاست

نمو دروے تو گلہائے باغ را چکنم
چو آفتاب بر آمد چراغ را چکنم

از سگان تو جدائی ز وفا داری نیست
ترک ارباب وفا قاعدۂ یاری نیست

---

(۱) مآثر الکرام ص ۲۳۲ - ۲۳۱ طبع حیدر آباد (۲) مراۃ الخیال - (۳) سرو آزاد، -

اور مثنوی کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ جس کی نسبت علامہ شبلی مرحوم کا یہ ریمارک ہے کہ:
'یہ شعر اس قابل ھے کہ اس پر سے ہزار مثنویاں نثار کر دی جائیں:

عشق حقیقی است مجازی مگیر
این دم شیر است به بازی مگیر' (۱)

رباعیات کے قلمی نسخے:

رباعیات سحابی کے قلمی نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتبخانوں میں پائے جاتے ھیں، چنانچہ اس کے متعدد قلمی نسخوں کا جن میں غزلیات بھی ھیں، ڈاکٹر اسپرنگر نے ذکر کیا ھے۔ (۲) 'منتخب رباعیات سحابی' کے ایک مخطوطے کا ذکر ریو نے بھی کیا ھے۔ جو بترتیب حروف تہجی عہد محمد شاہ میں ۱۱۳۳ھ کا لکھا ہوا، ۳۲۹ نمبر پر عجائب خانہ' لندن میں موجود ھے۔ (۳) عالمگیری امرا میں سے محمد سمیع نامی ایک شخص کے کتبخانے کا نسخہ 'منتخب رباعیات سحابی، علامہ شبلی کی نظر سے گزرا تھا جس کی نقل انھوں نے کر لی، تھی۔ آجکل یہ نسخہ ندوہ کے کتبخانے میں موجود ھے کتبخانہ آصفیہ (حیدر آباد) میں بھی اس کے نسخے پائے جاتے ھیں۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں مکرمی سید سلیمان صاحب ندوی نے راقم کو اطلاع دی تھی کہ رباعیات سحابی کا ایک نسخہ مع دیباچہ مولانا حبیب الرحمان خان صاحب شروانی کو ملا ھے، نیز یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ علی گڑھ میں ایک صاحب اسکو چھپوانا چاھتے ھیں۔ نہیں معلوم پھر اس کا کیا حشر ہوا۔

---

(۱)۔ الندہ شعبان ۱۳۲۵ھ ص ۵۔ (۲)۔ اودھ کیٹلاگ ص ۵۵۲، ببلوتھیکا اسپرینگریانا ص ۸۲، طبع جرمنی۔ اسپرینگر ص ۸۳ طبع جرمنی اسپرنگر نے اس کے ۵۰۰ صفحات بتائے ھیں اور لکھا ھے کہ ۹۵۰ھ میں سحابی گزرا ھے (۳) فہرست ریوج ۲ ص ۷۲۔

ہمارا مخطوطہ :

راقم کے کتبخانے میں ایک مختصر مجموعہ رباعیات سحابی کا موجود ہے - جو چھوٹی تقطیع کے ۵۸ صفحوں پر تمام ہوا ہے۔ کاغذ دبیز اور احمد آبادی معلوم ہوتا ہے -

شروع میں مثنوی کے یہ تین شعر ہیں - جو مخزن اسرار کی طرز پر اور اسی بحر میں ہیں -

بسم الله الرحمن الرحیم
تیرتنہابست بدیو رجیم
تا ننماید ز دجائی غرور
راهروان را ره الله نور
شکرے از مصر کلامش خورند
ره ز کلامش بسلامش برند

پھر ذیل کی ایک نعتیه غزل ہے(۱)

السلام ای نه فلک سرگشته درکار شما
عقل کل دیباچهٔ دیوان اسرار شما
السلام ای هرچه گویند و کنند اهل کمال
شرح گفتار شما و وصف کردار شما
السلام ای علم و فضل انبیاء و اولیاء
پرتوے از آفتاب ماه انوار شما
السلام . (۲) . روح القدس یعنی مسیح
بسته نطقے از خجالت پیش گفتار شما
السلام ای کل شی هالک الا وجهه
هست از روی حقیقت مغز اشعار شما

---

۱ - اس غزل کو دیکھتے ہوے علامہ شبلی کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ : وہ (غزلیات) ایسے سوتی نہیں ہیں کہ سحابی کے تاج کمال پر ٹانکے جائیں۔
(۲) ممکن ہے 'اے ثانی، ہو۔

السلام ای پادشاهان جهان سروری
بهر فخر سر بلندی نقش دیوار شما
السلام ای رهروان راه اسرار تمام
شوق دیدار شما معراج رفتار شما
السلام ای معدن دریاشدن تحقیق را
نکتهٔ کافی ازان لعل درربار شما
السلام ای بندهٔ سرگشته را یعنی سحاب
کرده آزاد از دو عالم شوق دیدار شما

اس کے بعد صفحہ ۱ سے ۲۷ تک دیباچۂ نثر ہے - پھر ص ۲۸ سے ۳۹ ص تک ایک مثنوی بحر خفیف مسدس مخبون مقصور (یعنی فاعلاتن مفاعلن فعلات) میں ہے جس کے ۲۱۰ اشعار ہیں - موضوع اس کا اخلاق و تصوف ہے -

ص ۴۰ سے ۵۸ تک ۱۷۶ رباعیاں ہیں جو ردیف وار حرف تا تک پہنچی ہیں سنہ کتابت مذکور نہیں ہے - کاغذ کی کہنگی اور تحریر کی قدامت بتاتی ہے کہ یہ نسخہ بارھویں صدی میں لکھا گیا ہو گا، یعنی ڈیڑھ سو دو سو برس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا -

دیوانِ میر رضی

۱۳۲۴ھ میں جبکہ راقم کے برادر مکرم مرحوم سومنات پٹن تشریف لیگئے تھے، اسوقت پٹن میں راقم کے خویش و اقارب کے ھاں انکے بزرگوں کا ایک بہت بڑا کتبخانہ تھا، جو بسبب مرور ایام وعدم انتظام قریب معدوم ھو جانے کے تھا، بھائی صاحب مرحوم کو اس کے دیکھنے کا اشتیاق تھا، چنانچہ انھوں نے اسکو ٹٹولا تو تمام ذخیرۂ کتب کو دیمک کی نذر پایا، صرف ایک قلمی نسخہ صحیح و سالم 'دیوان میر رضی' کا ھاتھ لگا، یہ دیوان اس وقت راقم کے پاس موجود ھے، مگر افسوس ھے کہ سوائے تذکرہ آتشکدہ کے کسی تذکرے میں میر رضی کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، میں نے بیسیوں تذکرے اس مطلب کے لیے دیکھ ڈالے، تاھم اس دیوان کے مطالعہ سے بعض حالات کا انکشاف ھوا ھے جنکو مجملاً ہدیۂ ناظرین کرتا ھوں۔

مصنف کا نام جو دیوان کے آخر میں لکھا ھوا ھے۔ 'میر رضی ارتیمانی، ھے، صاحبِ آتشکدہ نے صرف سطور ذیل پر اکتفا کیا ھے:

'میر رضی از سادات ارتیمان (ھمدان) من محال تو سرکان سیدے کریم الطبع حسن الخلق بودہ تخلص باسم می کند، تخمیناً یک ھزار گفتہ از وست پد نگفتہ ۔'

اور نمونۂ کلام میں چند اشعار ان کے دیوان سے نقل کر دیے ھیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں لکھا، البتہ مصنف کے کلام سے معلوم ھوتا ھے کہ وہ شاہ عباس صفوی کے عہد میں تھے، جس کی سلطنت کا زمانہ ۱۶۳۰ء سے ۱۶۶۸ء تک ھے، چنانچہ شاہ عباس کی مدح میں چند قصائد

پائے جاتے ہیں، ایک قصیدے کے دو شعر پیش کرتا ہوں جن میں شاہ عباس کا نام آتا ہے :

بخورسے که در دور عباس شاه
به کاهے به بخشند کو هے گناه
سکندر توان و سلیمان شدن
ولے شاه عباس نتوان شدن

میر رضی مذہباً شیعہ تھے، اور شیعہ بھی غالی جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہو گا جو حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں لکھے ہیں :

دیگر بخداے بر نداری دست
بشناسی اگر علی عمر آن را

اے خجل از مدح تو مدح و ثنا
عاجز اندر سرتو عقل بشر
من که و شعرم چه و مدحم کدام
اے خدا و مصطفایت مدح گر
کس نبودے مثل تو مانند او
مثل خود میداشتی ایزد مگر
اوست بالله اوست مجرئی قضا
اوست بالله اوست منشئی قدر
گر شفیق ما نه‌ٔ کیف المدار
ور شفیع ما نه‌ٔ این المفر

مصنف کے حسن اخلاق اور کریم الطبعی کی نسبت صاحب آتشکدہ کا بیان کافی ہے۔ دنیوی حالت کے لحاظ سے شاید وہ تنگ دست تھے، اس لیے کہ جو قصائد انھوں نے بادشاہ کی مدح میں لکھے ہیں ان میں جا بجا اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے :

جام جہان نماست ضمیر منیر تو
یک یک درو نمایان اعمال این وآن
شرح غم فقیران از رنگ چہرہ یاب
درد دل اسیران از لوح جبہه دان

یااللہ هرکه هر چه تمنا کند دهی
داده تراچه حاجت امدادانیں وآن
بخشیده هر چه باید و شاید ترا خدا
تو نیز بخش هرچه بهرکس که میتوان
خواهی که دمبدم زخدایت مدد رسد
امداد ناتوان بفرمائے ناتوان
کارشکستگان جهان را درست کن
کارت درست ساخته یزدان انس و جان
گاہے سوال عاجز و مسکین و بینوا
حرف 'نه' هرگزت نگزاشت است بر زبان

تعجب نہیں اگر میر رضی ہندوستان میں بھی آ چکے ہوں، ذیل کے دو شعر اس کی تائید کرتے ہیں۔ :

بگیرید زنجیرم اے دوستان
که پیام کند یاد هندوستان

ندیدم جز جفا از خط و خالتی
نمی دارد وفا هندوستانی

کلام:

ہر صنف نظم میں میر رضی کا کلام موجود ہے، اور اس سے شعر و سخن پر ان کی پوری قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ میرے خیال میں متاخرین شعرائے ایران قاآنی و نشاط وغیرہ کے کلام کے ساتھ ان کے کلام کا مقابلہ کرنے سے ان کی وقعت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام پر صاحب آتشکدہ نہایت مختصر، مگر ناک بھوں چڑھاکر 'بدنگفتہ' کہہ کر رہ گیا ہے، اور اس طرح ان کو بالکل ایک معمولی درجے کا شاعر خیال کر کے ان کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا، اور نہ ماہرین ادب فارسی کے نزدیک ان کا کلام متاخرین میں سے بعض سے کمتر اور اکثروں سے بہتر درجہ حاصل کرنے کا مستحق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے زمانے میں ان کا کلام مقبول خاص و عام تھا، جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :

انجمنها پر ز دیوان رضی ست
عالم از آدم تہی بوده مگر

میر رضی کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے، چنانچہ ان کے اشعار کی کل تعداد جو ان کے موجودہ دیوان میں تقریباً ۱۴۷۶ ہے، ان میں بعض کلام ایسی بحروں میں ہے جن میں سوائے قادر الکلام کے کوئی مشکل سے شعر کہہ سکتا ہے، وہ ہمیشہ چھوٹی بحروں میں لکھتے ہیں حتیٰ کہ بعض قصائد میں بھی انہوں نے یہ روش اختیار کی ہے، قدما کے طرز پر ساقی نامے بھی لکھے ہیں، اور ان میں برابر پھلنے پھولنے ہیں۔ تنوع تخیلات، ندرت تشبیہات، سلاست زبان اور اکثر جگہ فارسی محاورات کا استعمال ان کی غزلیات کا امتیازی وصف ہے۔

ہمارے ہاں 'طمانچہ مار کر منہ لال رکھنا' محاورۃً بولا جاتا ہے، اس کی اصلیت فارسی ہے، چنانچہ میر رضی نے اس کو اسطرح کھپایا ہے:

رضی سان سرخ دارم از طپانچہ روی خود ترسم
که ننگ لاغری از کشتنم سازد پشیمانش

دیوان:

ان کے دیوان کا قلمی نسخہ راقم کے پاس ہے چھوٹی تقطیع پر ایرانی خط میں خوشنما لکھا ہوا ہے، جس میں غزلیات، قصائد، ساقی نامہ، رباعیات وغیرہ کل اشعار کی تعداد ۱۴۷۶ ہے، اس دیوان کا کاتب محمد صالح ابوالعالی‌الحسنی الخورزمی القرشی ہے جس نے اس دیوان کو شہرلا ھجان میں ۱۰۵۵ھ میں لکھا ہے۔

اس دیوان سے یہاں چند اشعار نمونۃً نقل کرتا ہوں:

هجرت ز وصل غیر خبرمی دهد مرا
مرگم نوید مرگ دگرمی‌دهد مرا

در خاطران شوخ مگر ناله اثر داشت
کامشب‌دلم از نالهٔ خود ذوق دگرداشت

گر سایهٔ برگ گل فتدبرتو
بر عارض نازکت نشان ماند

افتاده ام به بستر مرگ از تغافلت
سنگین دلا بیک نگهم می توان خرید

تا بسر شوری آن زلف پریشان دارم

نه سر کفر و نه اندیشهٔ ایمان دارم

پرده بردار که تا برهمه روشن گردد

کزچه رو مذهب خورشید پرستان دارم

باخیال رخت آسوده ام از محنت هجر

همر نوح چه اندیشهٔ طوفان دارم

ای رضی روزی کافر نشود آمین گو

زین خجالت که من از گبر و مسلمان دارم

نامۂ نامی

عربی اور فارسی ادبیات میں فن انشا ایک مخصوص ادبی شعبے کی حیثیت رکھتا ہے، اسلامی حکومتوں میں دارالانشا کا ایک خاص محکمہ ہوتا تھا۔ جس میں بڑے بڑے قابل ادیبوں اور انشا پردازوں کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ عربی اور ایرانی سلاطین کے درباروں میں اس محکمے اور اس کے افسر کی ایک خاص سیاسی اہمیت ہوتی تھی جس کے نقوش قلم بعض اوقات ملکوں اور سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔ اگرچہ سیاسی اور ملکی ضرورتوں نے اس فن کی بنیاد ڈالی تھی اور عموماً اس سے یہی کام لیا جاتا تھا، لیکن آگے چل کر اس فن نے ادبی حیثیت اختیار کر لی، چنانچہ بڑے بڑے نامور انشا پردازوں نے اس پر بکثرت کتابیں لکھی ہیں، جن میں اصلی مکاتیب یا ان کے نمونے درج کیے گئے ہیں، اور مدت دراز تک یہ کتابیں ہمارے مدارس میں داخل درس رہی ہیں۔

فارسی زبان کے فن انشا میں ایران اور ہندوستان میں بکثرت مجموعے تیار کیے گئے ہیں جن میں سے اکثر نے نصابی درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ہندوستان کے عہد مغلیہ میں ایرانی اور ہندی ادیبوں کے منشآت بکثرت ملتے ہیں، لیکن اس عہد کے ابتدائی زمانے کے منشآت پہ بہت کم کتابیں ملتی ہیں، اس اعتبار سے بابر اور ہمایوں کے عہد میں لکھے ہوئے ایک مجموعۂ انشا کا ذکر دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

غیاث الدین محمد بن ہمام الدین معروف بہ خوند میر،(۱) صاحب

---

(۱) - ان کے مفصل حالات کے لیے دیکھو تحفۂ سامی ص ۶۷ مطبوعہ ایران۔ لطائف نامۂ فخری ص ۱۰۲ مطبوعہ لاہور۔ تذکرۂ طاہر نصرآبادی ص ۲۰۷ مطبوعہ ایران۔ ہفت اقلیم (در فہرست کتبخانہ کلیہ بمبئی ص ۱۰۰)، فہرست ادبیات فارسی از براؤن جلد ۳ ص ۴۳۴۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۲ ص ۸۹۹۔ فہرست مخطوطات فارسی از ریو جلد ۱ ص ۹۶ تا ۹۸ ج ۳ ص ۱۰۶۲۔ تاریخ ایسٹ ج ۴ ص ۵۔

روضۃالصفا میرخوند کے نواسے (بھانجی کے بیٹے) تاریخ حبیب السیر کے مصنف، فارسی کے مشہور مورخ، ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ۸۷۹-۸۸۰ھ میں ہرات میں پیدا ہوئے، ترک سلاطین اور مغلوں کے دربار میں منشی اور مورخ کی حیثیت سے ملازم رہے، آخر میں بابر اور ہمایوں کے درباروں میں بڑی عزت سے بسر کی۔ اور ۹۴۱-۴۲ھ میں بعمر ۶۰ سال دھلی میں وفات پائی، اور اپنی وصیت کے مطابق حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت خواجہ امیر خسرو قدس اللہ سرھما کے مزارات مقدسہ کے قریب مدفون ھوئے۔ متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، جن میں سے صرف بارہ کتابوں (۱) کے نام تذکروں میں ملتے ھیں، ان کے علاوہ اور بھی تصانیف ھوں گی، جن کا آج پتہ نہیں ملتا۔ ان کی تصنیف سے فن انشا میں ایک رسالہ ھے، جس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا، اس کا نام 'نامۂ نامی' ھے۔ اب تک اس کے صرف تین قلمی نسخے دریافت ھوئے ھیں ایک نسخہ کتبخانہ ملا فیروز (بمبئی)) میں (جواب کاما انسٹیٹیوٹ کے ساتھ شامل کر دیا گیا ھے) موجود ھے اور ۱۱۶۰ھ کا لکھا ھوا ھے(۲) دوسرا نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانے میں ۲۰۵۵ پر ھے تیسرا نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے خزائن مخطوطات میں موجود ھے۔ جو ۱۹۲ اوراق میں بخط نستعلیق ۱۱۰۸ھ کا مکتوبہ ھے۔(۳)

یہ کتاب نایاب ھے۔ انڈیا آفس کے کتبخانہ میں مخطوطے کا ذکر کرتے ھوئے ایتھے نے بھی اس کو نایاب بتایا ھے، اور لکھا ھے کہ اس کا صرف واحد نسخہ انڈیا آفس میں ھے، (اس نے ایک اور ناقص نسخے کا بھی

---

(۱) - ان کی تصنیفات کے نام یہ ھیں:- ۱- مآثرالملوک -۲- خلاصۃ الاخبار -۳- مکارم الاخلاق -۴- دستورالوزرا -۵- اخبار الاخیار -۶- جواھرالاخبار -۷- غرائب لاسرار -۸- منتخب تاریخ وصاف -۹- نامۂ نامی -۱۰- روضتہ الصفا جلد هفتم -۱۱- حبیب السیر -۱۲- قانون ھمایوں یا ھمایوں نامہ - ان میں سے اب تک نمبر ۱۱ اور ۱۲ شائع ھو چکی ھیں۔ ان کی تصانیف کے لیے ملاحظہ ھو: کشف الظنون ج ۱ ص ۱۹۹ ص ۴۷، ص ۴۹۲، تاریخ ایسٹ ج ۲ ص ۳ تاریخ ادب فارسی بعہد مغول از عبدالغنی ج ۱ ص ۹۶، ص ۱۴۳

(۲) فہرست کتبخانہ ملا فیروز مرتبہ رھتیسک۔

(۳) - اورنتیل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء ص ۸۶ -

ذکر کیا ہے جو نمبر ۱۷۶۲ پر موجود ہے) حالانکہ ان تین نسخوں کے علاوہ ایک۔ چوتھا نسخہ راقم کے کتب‌خانے میں موجود ہے، جس پر یہاں تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

ہمارے پاس 'نامۂ نامی' کا جو مخطوطہ ہے، وہ سنہ ۱۱۰۹ھ کا لکھا ہوا، اور خط نسخ میں ہے، ۸۲ صفحات میں ۵×۸ کی تقطیع پر ہے، اس میں سے اوراق ۱ - ۲ - ۳ - ۳۲ اور آخر میں سے بعض صفحات غائب ہیں کتاب کا سنہ تصنیف کہیں لکھا ہوا نہیں ہے، لیکن دیباچے میں مصنف نے ذکر کیا ہے، کہ اس کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۴۶ یا ۴۷ سال سے متجاوز تھی، سنہ ۹۴۲-۹۴۳ھ میں ان کی وفات ہوئی اور ۷۰ سال کی عمر پائی، اس لحاظ سے اس کتاب کا سال تصنیف ۹۲۰ھ میں پڑتا ہے، سبب تالیف کے ذکر میں مصنف رقم طراز ہیں :

'بحسب مناسب ازلی بلکه بمحض ارادت لم یزلی، از مبادی سن رشد و تمیز تا غایت که سنین عمر عزیز از حدود اربعین و شش هفت تجاوز کرده همواره بانشاء مؤلفات غریب و املاء منشات بدیع مائل و راغب می بوده و هر گاه از شواغل جزیل فراغتے دست می داد بسواد الفاظ و عبارات بلاغت آیات اشتغال می نمود، و این معنی بمثابه عادت طبیعت این بے بضاعت شد که باوجودیکه درین ایام بواسطهٔ نوایب روزگار و مصائب لیل و نهار بر عناکب نسیان بر مناکب فن انشا تنیده و دیدهٔ بینا اجزاء آن را جز برطاق فراموشی ندیده این خیال در سر و این اندیشه در خاطر پیدا شد که سطرے چند از نہان‌خانهٔ ضمیر بر صفحه ظهور آورد، الفاظے دل پسند در شیوهٔ ترسل بر صحائف خاطر نگارد۔' (ورق ۲)

اس کتاب کو مصنف نے ایک عنوان، نو سطر اور ایک تتمے پر تقسیم کیا ہے، پھر عنوان کی تقسیم دو لفظ میں کی ہے۔

'لفظ اول در بیان هدایت ظهور انشاء و صنعت کتابت و ذکر ابتدا مکاتیب باسماء الله تعالی و بعضی دیگر از رسوم کتاب و الکحل۔'

اس عنوان کے ماتحت کتابت کی ابتدا اور خطوط اللہ‌تعالیٰ کے نام سے شروع کرنے کی مختصر تاریخ ازروئے روایات اسلامی بیان کی ہے، اس میں جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں، ان کے نام یہ ہیں :

(۱) کتاب المعارف لابن قتیبه۔
(۲) آداب الوزراءلاحمد بن جعفر بن شادان۔

(۳) شرح دیوان حضرت علی رض از قاضی کمال الدین امیر حسین یزدی۔
(۴) تاریخ حافظ آبرو۔

لفظ دوم کا عنوان ہے، 'در بیان ترتیب و تقسیم و تتمیم، یعنی طبقات انسانی کی ترتیب و تقسیم، تین طبقات، اشرف، اوسط اور ادنیٰ میں کی ہے۔ اسی ترتیب سے ۱ تا ۴ سطر میں انھوں نے ان طبقات کے لوگوں کے نام سے مکاتیب کے نمونے لکھے ہیں، اور سطر پنجم میں اعزہ اور احباب وغیرہ کے نام خطوط ہیں، سطر ششم میں تہنیت نامے اور سطر ہفتم میں تعزیت نامے لکھے ہیں، سطر ہشتم میں فرامین اور سطر نہم میں متفرق رقعات ہیں، تتمیم میں رباعیات، قطعات، معمیات، تواریخ اور وقائع درج ہیں۔

عنوان کے لفظ اول میں مصنف نے آداب مراسات کے سلسلے میں تین چیزوں کی مختصر تاریخ لکھی ہے :

(۱) خط کے آغاز میں خدا کا نام لکھنے کا رواج۔
(۲) خط کی تحریر پر خاک چھڑکنے کا رواج۔
(۳) خط کے آخر میں مہر لگانے کا رواج۔

مصنف تاریخ حافظ آبرو کے حوالے سے لکھتے ہیں، کہ سب سے پہلے جس نے خطوط کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھا وہ بہمن بن اسفندیار تھا۔ پھر لکھا ہے، کہ اہل عرب قبل از اسلام مکاتیب کے شروع میں 'باسمک اللھم، لکھا کرتے تھے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث بہ رسالت ہوئے تو آپ کے چار مکاتیب کے شروع میں 'باسمک اللھم، لکھا گیا (۱)۔ اس کے بعد سورۂ ہود نازل ہوئی تو اس آیت 'بسم اللہ مجریھا ومرسھا' کی بنا پر 'باسمک اللھم، کی بجائے لقبہ 'بسم اللہ، لکھنے لگے، پھر سورۂ بنی اسرائیل نازل ہوئی تو اس کی آیۃ 'قل دعواللہ

---

(۱)۔ مکاتیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجموعہ حال ہی میں ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدرآبادی نے شائع کیا ہے' اس میں جو مکاتیب چھپے ہیں ان میں سے صرف ایک مکتوب کے شروع میں 'باسمک اللھم' لکھا ہوا ہے، (دیکھو مجموعہ، الوثائق السیاسیہ ۱۶۹) غیر مسلموں کے جواب اور عموماً صلحناموں اور دستاویزوں کے شروع میں 'باسمک اللھم' پایا جاتا ہے۔

اودعوا الرحمن' پر سے 'الرحمن، اوز سورۂ نمل کے نزول کے بعد 'آیة 'انه من سلیمان و انه بسم الله الرحمن الرحیم' کے تتبع میں 'رحیم' کا اضافہ کر کے 'بسم الله الرحمن الرحیم، لکھنے لگے (۱) پھر ایک مدت کے بعد اس میں اختصار کیا گیا اور خطوط کی نوعیت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں کو خطوط کی پیشانی پر لکھنے لگے، مثلاً فتح ناموں میں 'ھوالفتاح، تعزیت ناموں میں 'ھوالقیوم، لکھا جانے لگا، اور آگے چل کر اس قدر اختصار ہونے لگا کہ اکثر مکاتیب میں صرف لفظ 'ھو، کے سوا کچھ بھی نہ لکھا جاتا تھا۔

لفظ 'امابعد، جو خطوں میں لکھا جاتا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کی اختراع کعب بن لوی بن غالب نے کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد عظام میں سے تھے' اسی طرح خط کے آخر میں کاتب کا نام لکھنے کی ایجاد حضرت ابی رض بن کعب انصاری نے کی تھی جو کاتبان وحی میں سے تھے۔ خطوط پر خاک چھڑکنے کی جو رسم ہے، اس کا سبب یہ ہے، کہ حضرت جابررض بن عبداللہ انصاری حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا، 'اذا کتب احدکم فلیتربه فان التراب مبارک و ھو انجح الحاجة، (۱) مصنف آداب الوزرا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان معجز بیان سے اطراف کے فرمانرواؤں کے نام مکاتیب لکھے گئے، تو نجاشی کے مکتوب پر خاک چھڑکی گئی اور وہ بادشاہ عالیجاہ اس کو پڑھنے کے بعد مشرف به اسلام ھوا، اور کسریٰ کے خط پر اتفاق سے خاک نہیں چھڑکی گئی تھی، چنانچہ وہ اس سعادت سے محروم رھا،اگر یہ روایت اور جو حدیث اوپر نقل ھوئی ہے، صحیح ھوں تو حاجت برآری کے لیے خاک چھڑکنا لازم و واجب ہے۔

اسی طرح خط کے آخر میں مہر لگانے کا طریقہ بھی بقول مصنف عہد اسلام میں رائج ھوا، چنانچہ سنہ ۶ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین اطراف کو دعوت اسلام کے خطوط لکھنے کی فرمائش کی تو بعض صحابہ نے

(۱) یہ تمام تفصیل قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں مفصل طور پر لکھی ہے دیکھو اس کا ملخص' ضوء الصبح المسفر ص ۲۹۲ ۔

(۲) ۔ النہایہ لابن اثیر میں یہ حدیث اس طرح منقول ہے، اتربوالکتاب فانه انجح الحاجة ۔

جو قیصر روم اور بعض بادشاہوں کے درباروں میں جا چکے تھے عرض کی
کہ جس خط کے آخر میں مہر نہیں ہوتی ، سلاطین اس کا اعتبار نہیں
کرتے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسم شریف کی مہر
بنوانے کا حکم فرمایا، اور انگشتری کے نگینے پر 'محمد رسول اللہ' (۱) اور ایک
روایت کے مطابق لا الہ الا اللہ کندہ کرایا، اس کے بعد سے خلفا اور سلاطین
اسلام نے اس کا اتباع کیا - (۲)

کتاب کے ضمن میں بعض مفید معلومات ملتی ہیں، مثلاً ہر طبقے
کے لوگوں کے القاب و آداب کے سلسلے میں مصنف نے وزرا، مستوفی، صدر
وغیرہ کے متعلق بعض ضروری معلومات مہیا کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان
عہدوں کی ابتدا کب سے ہوئی، ان عہدوں پر کون کون مشاہیر فائز
ہوئے، ساتھ ہی ان اصطلاحات کی تشریح بھی کر دی ہے، علاوہ ازیں
اس میں بعض تاریخی معلومات بھی ملتی ہیں، اور اس لحاظ سے یہ کتاب
بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مستشرق ایتھے کی رائے ہے کہ :

'یہ کتاب بڑی تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہے، اس لیے کہ اس کے
اکثر خطوط اور رقعات وغیرہ جو خطوط نویسی کی مختلف اقسام کے
نمونے ہیں، مصنوعی اور فرضی نہیں ہیں، بلکہ خوندمیر کے زمانے
کے مستند دستاویز ہیں، (۳)

اس کتاب میں مصنف کا ایک مکتوب بنام بابر بادشاہ منقول ہے،
جو بابر کے فرمان کے جواب میں لکھا گیا ہے، اور اپنے نہ آ سکنے کا
عذر پیش کرتے ہوئے، مصنف نے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب
کے ترجمے کے چند اجزا بابر کے نام پر معنون کر کے بھیجنے کا ذکر کیا
ہے، بہت ممکن ہے کہ یہ کتاب 'جواہر الاخبار' ہو جو نامۂ نامی سے

---

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مکتوب بنام منذر
بن ساوی کے عکس میں آخر میں جو مہر لگی ہے، اس میں 'محمد رسول اللہ'
لکھا ہوا ہے دیکھو مجموعۃ الوثائق ص ۵۶ کے بالمقابل عکس مذکور) -

(۲) دیکھو ضوء الصبح المسفر صفحات ۳۹۵، ۳۰۶، ۳۴۲، علی الترتیب
اما بعد، خاتم اور ترتیب کے لیے -

(۳) - فہرست مخطوطات فارسیہ ص ۱۱۳۸ -

پیشتر لکھی گئی ہو گی۔ اس خط سے جو مصنف کی انشا پردازی کا نمونہ ہے، بابر بادشاہ کے ساتھ ان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ہم اس کو درج ذیل کرتے ہیں:

'در جواب فرمان همایون حضرت بادشاهی خلافت پناهی ظهیرالدین محمد بابر لازال ممدوحاً بلسان العبدوالحر نوشته :

فرمان ظفر نشان عالیجاهی
منشور جهان مطاع شاهنشاهی
چون مهرزاوج عاطفت کرد طلوع
شد موجب افتخار دولت خواهی

نشانی بسان آفتاب تابان منور زاویه مهجوران خاکسار او فرمانے مانند اختر نور افشان ضیابخش کاشانهٔ بندگان بیمقدار در زمانے همایون و ساعتے سعادت مقرون، از افق خلافت و سروری و مشرف عنایت و ذره پروری طلوع نموده، از پائے فتاده راکه جز وصول بدان آستان اقبال آشیان مرادی ندارد بدست مرحمت از خاک برداشت و از دست رفته را که غیر مدح و ثنائے خدام درگاه سپهر احتشام(۱) سر دولت باوج عزت افراشت۔ رباعی:

فرمان همایون تو مانند مهر
بر اوج کرم نقاب یکشود ز چهر
برداشت بدست لطف از خاک مرا
ز انسان که ز فخر سود فرقم بسپهر

اشارتی که درباب توجه این بے بضاعت بجانب درگه عالم پناه مرقوم قلم عنایت گشته بود، چنان اقتضا نمود که فی‌الحال قدم از سر ساخته، بلک مدهوش وار سرازپائی نشاخته احرام طواف آن کعبهٔ امانی و آمال بندد، و لبیک زنان پای در راه نهاده بعد از قطع بوادی مباعدت بسدنه سدره منزل پیوندد، اما بواسطه بعضی از موانع که نواب کامیاب بعرض

---

(۱) - یہاں سے کوئی فقرہ مثل 'کارے ندارد، غائب معلوم ہوتا ہے۔

خواهند رسانید روزی چند حصول آن ماسول در حیز تا خیر افتاد، و ورقی چند که در ترجمه بعضی از صحاح اخبار سید اخیار صلی اللہ علیه و آله الاطہار مرقوم خامه این شکسته گشته، و عنوان آن از ذکر اسامی و القاب ملازمان بلند جناب در زیب و زینت از صحف سایر اهل فضل و شرف در گزشته بنظر انور فرستاد امیدآنکه آن اجزاء بعین عنایت ملحوظ گردد و از حسن رعایت محظوظ، و امر المطاع اعلیٰ و ارفع۔، (ورق ۲۰ - ۱۹) -

مصنف نے ہر خط کے شروع میں ایک ایک رباعی لکھی ہے، جو ان کے اپنے بیان کے مطابق خودہ انہی کی ایجاد اور انہی کے نتیجۂ فکر سے ہے، چند رباعیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں ،

۱ - قاصد بر من نامه نامی آورد
نے نامه که منشور گرامی آورد
از بہر سر افرازی ارباب نیاز
بے شبه نشان دوست کا می‌آورد

۲ - آمد مرغی سفید از گلشن یار
مکتوب ببالش خطی از مشک تتار
مضمونش آنکه باز اقبال آثار
شد صیدهمای بخت آن شیر شکار

۳ - ای گشته کمیت قلمت خوش رفتار
طے کرده بساط نامه را شوق آثار
بنمود چو آن نامۂ نامی دیدار
کم گشت غم هجر نو از دل بسیار

۴ - از طرف چمن نسیم اقبال وزید
و ز گلبن امید گل لطف د مید
یعنی که ز حسن طالع و بخت سعید
پروانه التفات عام تو رسید

۵ - آن نامه که بود غیرت مشک ختن
پروانه اقبال رسانید بمن
بکشود بروی سینه ابواب سرور
بزدود زآئینۂ دل زنگ حزن

ان اشعار سے مصنف کی قدرت شعر گوئی کا بھی اندازہ ہوتا ہے -

مرآة الخیال

عہد عالمگیری کی ایک غیر معروف کتاب

فارسی کے قدیم و جدید شعرا' کے حالات میں جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں تذکرۂ مرآۃالخیال کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک سرسری تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اپنے مختلف اور متنوع موضوعات کے لحاظ سے وہ ایک علمی و فنی، ادبی اور تاریخی کتاب ہے، جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ شعرائے متقدین و متاخرین کے حالات کے علاوہ ضمنی مباحث علمیہ اور ذخیرۂ معلومات کے لحاظ سے وہ فارسی زبان کی ایک دائرۃ المعارف کہی جا سکتی ہے، خود مؤلف اپنی کتاب کی نسبت لکھتا ہے کہ اس نے ایک جلد میں ایک 'پورا کتاب خانہ، جمع کر دیا ہے۔ (۱)

مابعد کی تصانیف میں اس کتاب کا ذکر آیا ہے، چنانچہ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ کے مآخذ میں اس کو شمار کیا ہے (۲) اسی طرح سرو آزاد میں بھی بعض جگہ اس کا حوالہ دیا ہے (۳) سہ نثر ظہوری کے مرتب نے مقدمات میں موسیقی سے متعلق مرآۃ الخیال کا ایک طویل اقتباس (تقریباً ۳ صفحے) نقل کیا ہے اور اسی کتاب سے ظہوری کے حالات نقل کیے ہیں۔ (۴)

غیاث الدین نے اپنے لغت میں ہفت اقلیم پر جو مفصل مضمون لکھا ہے اس کے مآخذ میں مرآۃ الخیال کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۵) مستشرقین

---

(۱)۔ مرآۃالخیال ص ۲۰ طبع بمبئی (۲) خزانہ عامرہ ص۵ طبع لکھنؤ مؤلف کتاب اور آزاد دونوں ہمعصر ہیں۔ (۳) سرو آزاد ۲۲۳ طبع حیدرآباد، (۴) مقدمات ظہوری ص ۳ - ۴ اور ص ۱۲ تا ۱۵ طبع نولکشور، (۵)۔ غیاث اللغات ص ۵۵۴ مطبوعہ رزاقی پریس کانپور۔

یورپ میں سے بلینڈ (Bland) نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل (۱) میں اس کتاب پر تبصرہ لکھا ہے، ڈاکٹر اسپرنگر (Sprenger) نے اودھ کٹیلاگ (۲) میں اور اومر (Aumer) نے میونچ کی فہرست کتب (۳) میں اس کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر ریو (Rieu) نے عجائب خانۂ لندن کی فہرست مخطوطات فارسی (۴) میں اس کے مضامین کی فہرست دی ہے اور اس کے چار قلمی نسخوں (۱۴۲۱، ۱۱۷۲۴، ۱۶۸۲۵، ۱۶۷۲۹) کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک نسخہ ۱۱۸۳ھ کا لکھا ہوا ہے، جو تالیف کتاب کی تاریخ سے ۸۱ برس بعد کا ہے۔ طامس ولیم بیل نے اس کے مؤلف شیر خان لودی کا مختصر حال لکھا ہے (۵) علامہ شبلی نے اپنے ایک مضمون 'جدید معلومات قدیم کتابوں میں' (۶) مسئلۂ تجاذب اجسام پر اس کتاب سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، اسی طرح اپنی معرکۃ الآرا تصنیف شعرالعجم کے ماخذ میں اسکو درج کیا ہے۔

مطبوعہ نسخہ:

ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں مرآۃالخیال کے قلمی نسخے اکثر پائے جاتے ہیں اور کوئی سو سال پہلے یہ کتاب ۱۸۳۱ء میں ٹائپ کے حروف میں کلکتہ سے شائع بھی ہو چکی ہے، اور جیسا کہ بمبئی اڈیشن کے خاتمے میں مرقوم ہے آقا محمد جعفر تاجر شوستری معروف بہ مولا نے اس کو چھپوایا تھا۔ اس کے بعد ۱۳۲۳ھ میں اس مطبوعہ نسخے پر سے بمبئی کےمشہورکتب فروش ملک الکتاب میرزا محمد خان شیرازی نے اپنے مطبع مظفری سے اس کا دوسرا اڈیشن شایع کیا، اور جیسا کہ آخر کتاب سے ظاہر ہوتا ہے اس کو مہاراجہ مدارالمہام بہادریمین السلطنتہ مشیر خطۂ دکن کے نام سے منسوب کیا ہے۔ مدارالمہام سے مراد غالباً سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد ہیں۔

یہ نسخہ متوسط تقطیع کے ۳۴۴ صفحات میں معمولی کاغذ پر چھپا ہے، جو ایک دو جگہ سے کچھ ناقص (۷) اور بعض مقامات پر غلط ہے، تاہم غنیمت ہے اور اس وقت مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

---

(۱) جلدنہم ص ۱۴۰ (۲) ص ۱۱۰، (۳) ص ۳، (۴) جلد اول ص ۲۶۹ تا ص ۳۷۰، (۵)اورئنٹیل بایوگریفیکل ڈکشنری ص ۳۸۰، (۶) دیکھو الندوہ بابت ستمبر ۱۹۱۰ء (۷)ص ۳۴۰، سطر ۱۶ کے بعد سے بعض سطور غائب ہیں،

موضوع کتاب :

شروع میں ۴ چار صفحوں کا ایک دیباچہ ہے، جو حمد و نعت پر مشتمل ہے، اس کے بعد صفحہ ۴ سے ۲۱ تک ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں شعر کے جواز پر مذہبی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اس کے بعد کتابت اور خطاطی کا مختصر تذکرہ ہے اور اس میں بہت سی مفید معلومات جمع کر دی ہیں، پھر حروف، الفاظ اور اعراب پر بحث کی ہے، اس کے بعد متقدمین شعرائے فارسی کے مختصر حالات رود کی سے لے کر آصفی تک (ص ۲۱ تا ۵۷) لکھے ہیں، پھر متاخرین شعرا میں عہد مغلیہ کے بعض ایرانی اور ہندی شعرا کا تذکرہ ہے، (ص ۵۷ تا ۹۴) پھر عہد مؤلف کے بعض معاصر شعرا و ادبا کے حالات ہیں۔ آخر میں شاعرہ عورتوں کا تذکرہ اور ان کے کلام کے نمونے دیے ہیں۔

قدیم شعرا کے حالات کے خاتمے پر مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ تاریخ اور تذکرے کی کتابوں سے لیے گئے ہیں، اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے وہ خود مؤلف کے قلم کا نتیجہ ہے۔ (۱)

اسی طرح دیباچے میں بھی مؤلف نے تصریح کی ہے کہ :

'ودر ایراد احوال قدما باختصار پرداخت چه آن اخبار ز مواضع متعدده معلوم میگردد واینجا بجز نقل چاره نبوده اما، در ذکر متاخرین باندازۀ طبع ناقص خویش جولانگری کلک خوش خرام خواهد نمود، (۲)

دیباچے میں مؤلف نے اپنی کتاب کا موضوع بیان کرتے ہوئے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اس کو مرتب کرنے میں مؤلف کا مقصد دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح بادشاهوں اور سلاطین وقت کی مدح سرائی نہیں ہے، اور چونکه اس کتاب کی تالیف میں اس کا مقصد اور تھا، اس لیے تذکرۀ شعراء کے علاوہ کئی باتیں خارج از موضوع بھی اس نے نقل کی ہیں، چنانچه رقمطراز ہے :

'چون راقم حروف را از تحریر و ترتیب این گلدستهٔ بهارستان خیال مقصدی دیگر در پیش است و شائبهٔ مدحت ملوک و خوانین پیرامون خاطر این غرض راه ندارد، و بناء علیه احوال ارباب سخن را دست آویز قوی در عذر 'سن صنف فقد استهدف، نموده بایراد مقدمات خارج که مناسب

---

(۱) - ص ۵۷ - (۲) - ص ۲ -

افتد گره کشائی رشتهٔ تزئین خواهد گردید۔' (۱)

ضمنی مباحث:

کتاب کے ضمن میں مؤلف نے معمولی اور ادنی رعایت کلام کی بنا پر مختلف علوم و فنون کی طرف گریز کی ہے، اور کئی ضمنی مباحث درج کر دیے ہیں، چنانچہ ذیل کے موضوعات پر اس نے ایک ایک علیحدہ رسالہ قلمبند کیا ہے، جو اپنی مفید معلومات کے لحاظ سے نہایت کارآمد ہے:

(۱) عروض و قافیہ (ص ۹۴ تا ص ۱۱۱)
(۲) صنائع و بدائیع (ص ۱۱۱ تا ص ۱۱۸)
(۳) علم النفس (ص ۱۳ تا ص ۱۲۷)
(۴) موسیقی (ص ۱۵۱ تا ص ۱۶۱)
(۵) علم تعبیر خواب (ص ۱۷۵ تا ص ۱۹۸)
(۶) علم فراست (قیافہ) (ص۱۹۸ تا ۲۰۴)
(۷) جغرافیہ (احوال اقالیم سبعہو بحاروانہار) (ص ۲۶۳ تا ص ۲۹۰)
(۸) علم اخلاق (ص ۲۱۰ تا ۲۳۳)۔

ان کے علاوہ کئی فوائد علمیہ درج کیے ہیں، مثلاً فن تفسیر (ص ۱۳۱ تا ص ۱۳۴) استعاذہ (ص ۱۳۴ ص ۱۳۹) ذکر خفی و جہری (ص ۱۴۷ تا ص ۱۴۹) وجود جنیات (ص۲۰۸، ص ۲۱۴) عشق (۲۱۷ ص ۲۲۴) بیان خمر (ص ۲۲۵ ص ۲۲۸) شرح جامی بر بعض اشعار قصیدۂ خمریہ' ابن الفارض رح (ص ۲۳۱ - ص ۲۳۸) علم طب (ص ۲۶۱ ص ۲۶۳)۔

ان مضامین متنوعہ و موضوعات مختلفہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کتاب چھوٹی سی انسائکلوپیڈیا ہے ۔

مآخذ کتاب:

اثنائے تالیف میں مؤلف کو مختلف علوم و فنون کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہے، جیسا کہ ان کتابوں کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے اس کتاب کے ماخذ میں مؤلف نے ۵۸ کتابوں کا ذکر کیا ہے

---

(۱) - ص - ۲۱

ان میں وہ متعدد دواوین شامل نہیں ہیں جن سے شعرا کا کلام نقل کیا گیا ہے۔ ان ماخذ کی تعداد موضوعات کے لحاظ سے حسب ذیل ہے :

تفسیر	۱۰	تصوف و اخلاق	۱۵
حدیث	۱	تاریخ	٦
جغرافیہ	۱۲	موسیقی	۲
تذکرۂ شعرا	۴	عروض و قافیہ	۳
شعر و ادب	۴	متفرقات	۳

ان میں بعض کتابیں ایسی ہیں جو بالفعل نایاب ہیں۔ مثلاً رسالہ مفتاح الجمال و تفسیر ملا شاہ، تاریخ شاہرخی، حوض الحیات (یوگ)، رسالۂ مادھونل، مصنفہ شیخ عالم (موسیقی ہند)، گل اورنگ، تحفۃ الولایات (جغرافیہ)، وغیرہ اس سے مؤلف کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ تصنیف:

جیسا کہ خاتمۂ کتاب میں مؤلف نے قطعۂ تاریخ میں تصریح کی ہے یہ کتاب ۱۱۰۲ھ میں اتمام کو پہنچی :

این چمن زاریکہ مرآۃ الخیالش خواندہام
دارد از حسن معانی یک جہان رنگ کمال
صورت تاریخ انجامش توان بے 'پردہ،دید
گر تامل 'پردہ' بردارد ز 'مرآۃ الخیال'

یعنی مرآۃ الخیال کے اعداد ۱۳۱۳ میں سے پردہ کے (۳۱۱) عدد منہا کر دیے جائیں تو ۱۱۰۲ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔

خود مؤلف کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے بڑے بھائی عبداللہ خان کی وفات (۱۰۸۷ھ) کے بعد لکھنی شروع کی تھی اور اس وقت اس کی عمر ۳۰ سے تجاوز کر چکی تھی، چنانچہ لکھتا ہے، کہ:

'در اوایل قرن دوم ورقی چند گردآورد و بعضی از زادۂ طبع متقدین وبرخی از آوردۂ فکر متاخرین ثبت نمودہ۔' (۱)

---

(۱) - ص، ۳۴۱

تاریخی اهمیت :

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اس کتاب کی ایک خاص تاریخی اہمیت بھی ہے، مؤلف (بقول خود) عہد شاہجہانی میں پیدا ہوا اور مدتوں شاہجہان آباد (دہلی) میں رہا، عالمگیر کی تخت نشینی کے زمانے میں سن تمیز کو پہنچ چکا تھا، اس کا باپ شہزادہ شجاع کی نوکری میں تھا، اکثر امرا ؑعمائدین سلطنت، حکام اور شعرائے دربار کے ساتھ مؤلف کے مراسم تھے، اس لیے ممکن ہے کہ اس عہد کے اکثر واقعات اس کی نظروں کے سامنے وقوع پزیر یا معتبر ذرائع سے اس کے گوش زد ہوئے ہوں، لیکن چونکہ یہ تاریخی موضوع پر کوئی خاص کتاب نہیں ہے اس لیے ہمیں مؤلف سے یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی، کہ وہ اس میں اپنے عہد کے تمام حالات و واقعات سے بھی بحث کرے گا، البتہ اس نے بطور خود جستہ جستہ بعض تاریخی اور اپنے عہد کے جزئی امور کا تذکرہ کیا ہے، جن سے شاہجہان اور عالمگیر کی سیرت کے بعض پہلوؤں اور اس عہد کے بعض تاریخی امور پر روشنی پڑتی ہے اس لحاظ سے یہ کتاب تاریخی اسناد کا درجہ بھی رکھتی ہے، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس مقصد کے لیے کسی نے اس کو استعمال نہیں کیا۔

یہاں ہم بعض تاریخی امور بقید صفحات نقل کرتے ہیں :

۱ - مغل فرمانراؤں کی علمی قدر دانیاں، ان کے انعام و اکرام اور داد و دہش مشہور ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مؤلف نے مشہور فارسی شاعر محمد جان قدسی کے حالات میں لکھا ہے کہ اس نے ایک رنگین قصیدہ بادشاہ کی مدح میں لکھ کر پیش کیا، تو اس کے صلے میں بادشاہ نے مختلف قسم کے جواہرات منگوا کر ان سے سات مرتبہ اس کا منہ بھر دیا۔ (۱) اس سلسلے میں شاہجہان کی تعریف کرتے ہوئے مؤلف لکھتا ہے :

---

(۱) آزاد بلگرامی (سرو آزاد ص ۶۲) لکھتے ہیں کہ شاہجہان نامون کے مؤلف ملا عبدالحمید لاہوری اور ملا علاء الملک تونی اور صاحب عمل صالح نے بادشاہ کے مفصل حالات لکھے ہیں، مگر اس واقعے کے تذکرے سے خاموش ہیں، لیکن مؤلف بھی قدسی کا معاصر ہے اس لیے ممکن ہے کہ کسی ذریعہ سے اس کو یہ حال معلوم ہوا ہو۔

'بخششہائے بیدریغ ۰ احبقران ثانی وآدم شناسی و ہوشیاری و لشکر کشی و ملک گیری و طراحی عمارات و عیش‌وکامرانی و رعیت پروری و خدا ترسی و شیوۂ عدل و داد بر ساکنان ربع مسکون پوشیدہ نسیت اکثرے از ثقات بر آنند کہ در تیموریہ ہیچ پادشاہے جامع این صفات مستحسن بظہور نیامدہ ۔' (۱)

۲ ۔ اسی طرح میر رضی دانش کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس نے ایک غزل شاہزادہ داراشکوہ کی خدمت میں پیش کی' شہزادے نے اس حسن مطلع کے صلے میں ایک لاکھ روپیہ انعام دیا: (۲)

تاک راسیراب کن ای ابر نیسان در بہار
قطرہ تامے می تواند شد چراگوہر شود

خاندان مغلیہ کی شعرفہمی اور قدرشناسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے ۔

۳ ۔ ملا شیدا نامی شاعر کے حالات میں لکھا ہے کہ جب اس کا یہ مطلع :

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہرے
حسن را پرورد گارے عشق را پیغمبرے

شاہجہاں کے کانوں تک پہنچا تو فوراً اس کو ممالک محروسہ سے نکال دینے کا حکم دیا، آخر ملا شیدا نے معذرت میں ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا، ۲۷۰ شعر کا یہ قطعہ مؤلف نے نقل کیا ہے (۳)

اس واقعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو مذہب کا کس قدر پاس ادب تھا کہ، وہ ایک مسلمان شاعر کے منہ سے ایسے گستاخانہ الفاظ نہیں سن سکتا تھا، لیکن جب شاعر نے معذرت چاہی اور اپنے اس فعل سے نادم ہو کر توبہ کی کہ :

کنون ز توبہ بعذر خطا پزیر آنم
بوصف می نکشایم لب از رہ تقریر

تو اس کی خطا معاف کر دی ۔

۴ ۔ اسی طرح ایک اور واقعہ اس بادشاہ کی غیرت مذہبی کا منقول ہے، کہ چندر بھان نامی برہمن باشندۂ اکبر آباد (آگرہ) جو دارا شکوہ کی سرکار میں منشی گری کے عہدے پر مامور تھا اور نظم و نثر لکھنے میں دستگاہ

---

(۱) ۔ ص ۸۶ (۲) ص ۱۰۶۸، ص ۱۶۹ (۳) ص ۹۲

رکھتا تھا اس کا ایک شعر دارا شکوہ کو بہت پسند آیا، چنانچہ شہزادے نے دربار کے حاشیہ نشینوں سے مل کر بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ منشی چندر بھان نے ایک عجیب شعر کہا ہے۔ بادشاہ نے اس کو حاضر کرنے کا حکم دیا جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ:

'درین ایام شعر که بابا (دارا شکوه) از تو پسند کرده است بخوان ـ'

چندر بھان نے وہ شعر پڑھا :

مرا دلے ست بکفر آشنا که چندین بار
بکعبه بردم و بازش برهمن آوردم

اس شعر کو سن کر بادشاہ بہت برا فروختہ ہوا اور کہا کہ کوئی ہے جو اس کافر کو جواب دے سکے؟ ـ امرائے عظام میں سے افضل خان نے دست بستہ عرض کی کہ اگر حضور کا حکم ہو تو آج سے چار سو برس پیشتر کے ایک استاد کے کلام سے اس کا جواب عرض کروں، اور سعدی کا یہ شعر پڑھا :

خر عیسیٰ اگر بمکه رود
گربیاید هنوز خر باشد

بادشاہ باغ باغ ہو گیا، افضل خان کو انعام و اکرام عطا کیا، اور شاہزادے کو منع فرمایا کہ آیندہ سے ایسے لغویات حضور میں نہ پیش کرائیں اور چندر بھان کو نکال دیا ـ (۱)

اس موقع پر بادشاہ کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل لحاظ ہیں :

'خاطر مبارک بادشاه بشگفت شکر بجا آورده گفت : از تصرفات دین محمدی این قسم جواب رسیدوالامن از غصه هلاک می شدم۔'

۵ ـ شاہجہاں نے اپنے لیے تخت طاؤس کے نام سے ایک مرصع تخت بنوایا تھا، جس پر بیش قیمت ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ بقول مؤلف اس پر تین کروڑ روپیہ کی لاگت آئی تھی (۲) جب وہ بن کر تیار ہو گیا

---

(۱) ص۱۳۹ ـ ۱۴۰۔ (۲) لیکن شاہجہاں نامہ میں علاوہ کاریگروں کی تنخواہوں اور اخراجات کے صرف جواہرات و دیگر اشیا کی قیمت ایک کروڑ بتائی گئی ہے، یہ عہد مغلیہ کا روپیہ ہے جس کی قیمت تقریباً موجودہ سکے میں ایک روپیہ بارہ آنے کے برابر ہے ـ

تو ایک دن جشن تخت نشینی مقرر کیا، اور اس پر جلوس فرمایا، اس تقریب میں پایہٗ تخت کے شعرا نے تہنیت و مدح میں قصائد لکھ کر نذر گزرانے، جن میں سلطان شادمان کی یہ غزل بہت پسند کی گئی :

صبحدم کز فیض گشتم همنشین آفتاب
نقش نام شاہ دیدم در نگین آفتاب

اس موقع پر اس اسلامی تاجدار نے اپنے جذبہٗ خدا پرستی او ر جوش عبودیت کا جو ثبوت دیا ہے، اس کی نظیر ملنی دشوار ہے چنانچہ مؤلف رقمطراز ہے : "

"آوردہ اند کہ پادشاہ دیندارساعتے برآن سریر مکلف بکمال حشمت و نہایت تجمل نشستہ فرود آمد و دوگانہ بخضوع و خشوع تمام بجا آوردہ زمانے دراز درسجدہ بود چون سر برداشت فرمود کہدر روایت ارباب سیر آمدہ کہ تخت فرعون از عاج و آبنوس بود، او برآن تخت دعوای خدائی می‌کرد ۔ گواہ باشید کہ من بر این تخت مرصع دعوئی بندگی دارم، حضار مجلس از فضلاے نامدار و امرائے عالی مقدار متفق‌اللفظ بدعائے ازدیاد عمر و شکر توفیق بادشاہ اسلام زبان بکشادند ۔" (۱)

۶ ۔ اس میں کسی کو مجال انکار نہیں ہے کہ عالمگیر اپنے مذہب کا پکا پابند اور امور شرعیہ کا محافظ تھا، چنانچہ اس کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد ہی رسوم اکبری و جہانگیری اور بدعات دارا شکوهی و مراد بخشی کا خاتمہ ہوگیا ۔ ایک طرف اگر وہ احکام شرعیہ کے اجرا اور ان پر عمل کرانے کی کوشش کرتا تھا تو دوسری طرف اپنی انتہائی دور اندیشی اور سیاست دانی سے اپنے حریفوں کو نیچا دکھاتا تھا ۔

عالمگیر پر جہاں بھائیوں کے قتل کرانے کا الزام ہے، وہاں اس کے دامن دینداری پر سرمد کے خون ناحق کا دھبہ بھی مخالفین کی طرف سے ایک بدنما داغ بنا کر چمکایا گیا ہے۔ واقعے کے صحیح ہونے میں کلام نہیں لیکن اسباب و علل پر غور کیے بغیر کسی کو مورد الزام ٹھہرانا انصاف سے بعید ہے، اسباب خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی مگر اس میں شک نہیں کہ ان پر جس‌قدر زیادہ غور و تامل کیا جائے گا اسی قدر یہ جرم ھلکا نظر آئے گا، مذھب سیاست میں اپنے حریفوں کے ساتھ ذرا سی رعایت بھی

---

(۱) ص ۱٦٥ ۔

خطرۂ جان ثابت ہوتی ہے۔ اولاً سرمد سے داراشکوہ کو خاص ارادت تھی، ثانیاً سرمد کی ظاہری حالت (کہ باطن کا علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے) خلاف شرع تھی، پھر اس کے بعض اقوال سے شریعت غرا کے بعض مسلمہ عقائد پر زد پڑتی تھی، عالمگیر کے لیے یہ وجوہ بہت اہمیت رکھتی تھیں مؤلف کے عہد میں قتل سرمد واقع ہوا ہے، اس لیے اس کے وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے :

'(سرمد) همواره برهنه زیستی وبول و غایط در نظر خلق کردی، چوں خاطر سلطان دارا شکوه بجانب مجانین میل داشت باوی درگرفت و مدتی با تو-یفات او سرخوش بود تاآنکه روزگارطرح دیگر انداخت ودر سنه هزارو شصت و نه اورنگ خلافت و جهانداری بوجود فیض‌آمود ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاه غازی خلد الله ملکه و سلطانه مزین گردید، و آوازۂ خدا پرستی جهان را فرا گرفت . . . . درین هنگام خجسته آغاز فرخنده انجام که هر روز دین مبین را رونقی تازه و هر ساعت ملت بیضا را جلاے بے اندازه است، سرمد را تکلیف لباس کردند و اوازسودامزاجی تن نداده فی شهور سنه‌الف واثنین و سبعین (۱۰۷۲) به تیغ امر شریعت غرا مقتول گردیده، و عمده درکشتن سرمد این رباعی بود که ازان شائبه انکار معراج انام می آید، :

آنکو بصر حقیقتش یاورشد
خود پهن تراز سپهر پهناور شد
ملا گوید که برشد احمد بفلک
سرمد گوید سپهر دروے درشد، (۱)

۷ - سریر فرمانروائی پر عالمگیر بادشاہ جب حفظ قرآن کی دولت لا زوال سے بہرہ ور ہوا تو میرزا روشن ضمیر شاعر نے تہنیت میں یہ رباعی

(۱) - ص ۱۳۱ ص ۱۳۲ ۔ سرمد کے حالات و واقعہ' قتل کی نسبت عاقل خان رازی نے اپنی تاریخ (ص۸۹ - ص۹۰) میں لکھا ہے' سرمد کے مفصل حالات کے لیے دیکھو دبستان المذاهب (ص ۱۹۳ و ص ۱۹۶) اس کے قتل کے وجوہ کے لیے دیکھو مآثر الامرا' ج۱، ص۲۲۶ ص ۲۲۷ -

لکھ کر پیش کی :

شہ [illegible] محی الدین و مصطفے حافظ تو
صاحب سیفی و مرتضے حافظ تو
تو حامی شرعی و حامی تو شارع
تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

اس کے صلے میں سات ہزار روپیہ مرحمت ہوا (۱)

۸ - عالگیر ایک عملی آدمی تھا، خوشامد اور تملق سے اسے نفرت تھی، سلاطین مغلیہ کے دربار میں مدح گو شعرا کی کمی نہ تھی۔ سخن فہمی اور شعرا کی قدردانی اس خاندان کا ایک امتیازی وصف تھا، اور اگرچہ عالمگیر خود اعلیٰ درجے کا شعر فہم اور سخن شناس تھا، لیکن شعرا کی مبالغہ آمیز مدح‌سرائی سے اس کی طبیعت نفور تھی اور یوں بھی پابندی شرع متین کی بنا پر اس طرح کی خوشامدانہ اور مبالغہ آمیز شاعری وہ پسند نہیں کرتا تھا، چنانچہ مؤلف لکھتا ہے کہ جب عالمگیر تخت فرمانروائی پر جلوہ افروز ہوا، تو سلطان شادمان نامی شاعر نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر سنایا :

آن کیست کو زحقہ لعلت نشان دھد
در خواب اگر دھد بطریق گمان دھد

بادشاہ کو اس قصیدے کے بعض اشعار بہت پسند آئے تو ان کو دوبارہ پڑھنے کی فرمایش کی لیکن:

"ازا آنجا که این شاہ مستقیم‌الاحوال بنابر پاس‌مراتب‌شریعت بشعر میل‌ندارد و این صنعت را فعل عبث می شمارد فرمود ما بدولت نمی‌خواھیم که بعد ازین گرد این اندیشه بگرد خاطر تو گردد۔"

سلطان شادمان نے فوراً پائے مبارک پر ہاتھ رکھ کر اس کلام سے توبہ کی اور عمر بھر فکر سخن میں سر نہیں کھپایا ۔ (۲)

۹ - عالمگیر کے اپنے مدحیہ قصائد و اشعار نہ پسند کرنے کی تائید میں ایک اور واقعہ لیجیے، امرائے عالمگیری میں ملا شفیعا المخاطب بہ دانشمند خان ایک عالم و فاضل شخص تھا اس کی تحریک سے محمد علی ماہر نے بادشاہ کی مدح میں ایک مختصر سا رسالہ رنگین نظم و نثر میں

---

(۱) - ص ۱۵۰، ۱۵۱ (دیکھو تذکرۂ خوشنویسان‌ہند ص ۱۰۱
(۲) ص ۱۶۵ اس قصیدے کے ۲۲ شعر مؤلف نے نقل کیے ہیں

لکھ کر 'گل اورنگ، سے موسوم کیا تھا' اس کی نسبت مؤلف کا بیان ہے کہ:

'ہر کس که آن رساله را مطالعه نموده باشد انصاف درستی طبعش تواند داد لیکن ازانجا که این بادشاه دین پناه را بنا بر پاس مراتب شریعت باشعرو باارباب‌آن التفات کمتر است و مذہب مصنف نیز در نظر بود بدیدن و شنیدنش میل نفرمود۔' (۱)

۱۰ - اوائل ایام سلطنت میں عالمگیر نے حکم نافذ کیا تھا کہ دیوان حافظ کو لوگ اپنے کتب خانوں سے علیحدہ کر دیں اور ممالک محروسہ کے معلمین / اور اساتذہ طلبہ کو اس دیوان کا درس نہ دیں، بااین ہمہ دیوان حافظ بادشاہ کے مطالعۂ خاص میں رہا کرتا تھا اس پر مقربین بارگاہ نے عرض کی کہ یہ دیوان تو ہمیشہ حضور کے مطالعے میں رہتا ہے پھر اس کی ممانعت میں کیا راز ہے تو ارشاد ہوا:

'ہر کس را قدرت فہم رموز این کلمات نیست ممکن که ارباب غفلت‌برظاہر عبارت حمل نموده ورطهٔ بیباکی وعصیان فرو روند و برائے شرب خمر و شاهدپرستی آویز بدست آورده بهاویهٔ خذلان منہمک گردند (۲)

اس واقعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کو اپنی رعایا کے اخلاق و عادات کی حفاظت کا کس قدر خیال تھا، ہمارے زمانے کی حکومت نے فحش اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت کو ممنوع قرار دینے کے لیے جو قانون نافذ کیا ہے، اس سے تین سو برس پہلے اس نیک نہاد اسلامی تاجدار نے اس کا انسداد کر دیا تھا۔

۱۱ - مؤلف نے عالمگیر کے ایام شاہزادگی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جو اس کی خانگی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ 'والعهدة علی الراوی':

'گویند در ایام شاهزادگی یکے از پرستاران خاص که در شیوهٔ دلبری و مزاج دانی بے نظیر بود و در نغمه سنجی بمرتبهٔ که هر روزنقشے تازه به آهنگ دلفریب بسمع مبارک می‌رسانید بقضاے آسمانی رحلت نمود و مفارقتش برخاطر آن حضرت نهایت دشوار گردید روز دیگربجهت شکار برآمدند نواب‌عاقل‌خان ذز جلو بود چون مردم بهر جانب منتشر گردیدند و خلوت‌یافت بعرض رسائید که با این همه باراندوه و ملال که بر خاطر مباک فرود آمده است سواری شکار فرمودن چه حکمت خواهد بود، آن حضرت در جواب

(۱) ص ۲۰۷ - (۲) - ص ۲۲۵

این بیت اشاره نمود :

نالہ ھاےخانگی دل را تسلی بخش نیست
در بیابان میتوان فریاد خاطر خواه کرد

عاقل خان این بیت از اشعار خود بخواند :

عشق چه آسان نمود آه چه دشوار بود
هجرچه دشوار بود یار چه آسان گرفت

آن حضرت را بے اختیار رقت افتاد و زمانے در آنجا بود، چون افاقت یافت پرسید که این شعراز کیست گفت از شخصےاست که نمی خواهد بحضور بندگان حضرت بنام شاعرے موسوم گردد آن حضرت تبسم نمود و بکرات و مرات آن بیت را استماع فرموده یاد گرفت وازان روز نظر تربیت بیش از پیش بحال وےبگماشت تاآنکه بمنصب چہار هزاری رسانید و امروزکه دوازده(۱) سال است حضرت ظل الہی به تنبیه مفسدان دکن توجه دارند بیمن تدبیر و برکت صوبه داری وے مردم شاهجهان آباد و نواحی جمعیتے که در حضور بادشاه بود حاصل است۔' (۲)

---

(۱) عاقل خان ۱۰۹۰ھ ۱۶۸۰ء سے ۱۱۰۷ھ ۱۶۹۶ء تک دلی کا صوبه دار تھا، اس لحاظ سے اس کتاب کی تالیف کےوقت اس کو ۱۲ سال ہو چکے تھے۔ -

(۲) ص ۴۳۹ - ۴۴۰، - یہ واقعہ غالباً ہیرا بائی عرف زین آبادی بیگم سے متعلق ہے، جس کے ساتھ عالمگیر کے تعشق کا اسطورہ بعض نام نہاد مورخین نے اس افسانہ طرازی کے ساتھ وضع کیا ہے، کہ خود تاریخ کو اس پر تعجب ہے کہ ایک مشرقی شہزادے کا تعشق کوئی امر محال یا ناممکن الوقوع نہیں ہے حیرت صرف ان دروغ بافیوں پر ہے جو اپنے صریحی تناقص، اختلافِ تاریخی اور انتہائیمبالغہ کے ساتھ تاریخ کے نام سے پیش کی جاتی ہیں۔، (ملاحظہ ہو احکام عالمگیری مرتبہ جدو ناتھ سرکار) اس واقعے کی نسبت مؤلف کا ماخذ غالبا عاقل خان رازی یا اسکی تاریخ ہے۔، مآثر الامرا (ج ا ص ۷۹۲) میں یہ واقعہ بعینہ منقول ہے لیکن

(بقیہ اگلے صفحے پر)

بعض فوائد علمیہ :

ان تاریخی امور کے علاوہ اس کتاب میں کئی مفید اور کارآمد باتیں درج ہیں جن میں سے بعض ذیل میں بیان کی جاتی ہیں :

۱ - فردوسی کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے شاہنامہ کے علاوہ ایک اور مثنوی یوسف زلیخا کے نام سے لکھی تھی مگر موجودہ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی در اصل کسی دوسرے شاعر کی ہے اور فردوسی کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے۔ (۱) مؤلف کا بھی یہی خیال ہے کہ شاہنامہ کے سوا اس کی کوئی دوسری تصنیف نہیں ہے چنانچہ لکھتا ہے :

'چون از واردات فردوسی غیر از شاهنامه چیزے دیگر بگوش نرسیده بتحریراحوالش اکتفانموده شد' (۲)

۲ - لفظ 'موسیقی' کے متعلق کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور کیا معنی رکھتا ہے، بہت کچھ اختلاف ہے، بعض نے اس کو 'موسیقار' نامی پرندے سے منسوب کیا ہے اور بعض نے اس کو یونانی زبان کا لفظ بمعنی لحن بتایا ہے اس کے متعلق مؤلف کی تحقیق یہ ہے کہ :

'موسیقی لفظ سریانی است 'مو'دراصطلاح این طائفه 'هوا' راگویند و 'سیقی' بمعنی گره آمده یعنی صاحب این فن برهوا گره می زند۔' (۳)

۳ - ارتقاے' انسانی کے مسئلے سے بھی مؤلف باخبر تھا، چنانچہ لکھتا ہے :

(گزشتہ سے پیوستہ)

چونکہ مآثر بعد کی تصنیف ہے اس لیے صاحب مآثر نے یہ واقعہ عاقل خان کی تاریخ سے لیا ہو گا، یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جبکہ عالمگیر دوسری مرتبہ دکن کا صوبہ دار تھا، اسوقت اس کی عمر ۳۰ سال کی تھی لیکن پروفیسر جدوناتھ سرکار اس کی نسبت ریمارک کرتے ہیں کہ عالمگیر اس وقت ۲ بچوں کا باپ ہو چکا تھا، اور جذبۂ شباب سے لبریز نوجوان نہ تھا، بلکہ اس کے لیے دنیا میں تعشق کا زمانہ رخصت ہو چکا تھا۔ (ترجمہ احکام عالمگیری ص ۳۶)۔

(۱) دیکھو رسالہ اردو میں پروفیسر شیرانی کا مضمون (۲) - ص ۲۰۷،
(۳) ص ۱۵۱

'نشاة انسانی که برجمیع اطوار محیط است و بر تمام مراتب میار، چه‌اولاً در بدو وجود از رتبهٔ جمادی بمرتبهٔ نما رسیده و از نما بمرتبهٔ حیوان و از انجا بمرتبهٔ انسان انجامید۔، (۱)

۴ - تجاذب اجسام کے مسئلے کی نسبت مؤلف لکھتا ہے :

'ودر کتب قدیمه آمده که حال آسمان یا زمین چون حال مقناطیس است یا آهن، آسمان از جمیع اطراف زمین را برابر جذب می‌کند ازین سبب با اینهمه اثقال بر هوا ایستاده است۔، (۲)

(۵) حکماء نے تمام روے زمین کو 'ربع مسکون' لکھا ہے، مگر مؤلف کو اس کی صحت میں تردد ہے، چنانچہ لکھتا ہے :

'آب و خاک را با این همه وسعت حصه هاے متساوی نمودن بکدام دلیل خواهد بود چه برہمه کس ظاهر است که دریاے محیط را کنارهٔ دوم ناپیداست و باآنکه بادشاهی مثل اسکندر و ذوالقرنین باهمه حکمائے یونان که همراه داشت هر چند تلاشها کرد، جهازها فرستادو مطلقاً چیزے ازان کنار ها نیافت و ایضاً در حقیقت زمین نوشته اند که دریاے محیط بگرد اکثرے ازاں درآمده است الا درجنوب مغرب و شمال مشرق هیچکس بدریانرسیده، چه بنابر بخارات کثیفه و جبال شاهقه و اشجار متراکمه وکر یوه و مغاک پیهم آدمی را عبور بر آن دو سمت میسر نبا شد و لیکن از قیاس تخمیناً گویندکه دران حدودهم دریا خواهد بود و همچنین از حقیقت ظلمات کس آگه نگردیده که دز آنجا آب و خاک چه مقدار بوده باشد دراین صورت زمین نیزغیر معلومة الاحوال ست پس این دو چیز نا معلوم را چهار حصهٔ مساوی نمودن وازانجمله زمین رایکحصه قراردادن چه معنی داشته باشد۔، (۳)

---

(۱) ص ۳۱۲- (۲) ص ۳۰۶ طبع کلکته هم نے یه عبارت الندوه میں علامه شبلی کی منقوله عبارت سے نقل کی ہے، جو انهوں نے غالباً کلکته کے مطبوعه نسخے سے لی ہے' بمبئی کے اڈیشن میں یه عبارت نہیں ہے۔

(۳)- ص ۲۸۹- ۲۹۰-

تذکرۂ مؤلف:

مضامین کتاب کو بیان کرنے کے بعد اب ہم مؤلف کے حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:

مؤلف کا تذکرہ سوائے ایک آدھ کتاب کے اور کہیں نہیں مل سکا، طامس ولیم بیل نے اس کی نسبت چند سطریں لکھی ہیں جو زیادہ تر اس کے نام ولدیت اور موضوع کتاب پر مشتمل ہیں۔(۱) البتہ خود مؤلف نے اپنی اس کتاب میں جا بجا اپنے بعض حالات کی طرف اشارات کیے ہیں، جن سے اس کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور انہی کی مدد سے ہم نے اس کا یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔

نام اور ولادت:

مؤلف کا نام شیر خان لودی ہے اور اس کی ولادت عہد شاہجہانی میں ہوئی تھی چنانچہ اپنی کتاب میں اس نے دو مرتبہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے(۲) ایک جگہ (ص ۱۲۰) مؤلف نے اپنے سلسلۂ تعلیم کو بیان کرتے ہوئے ۱۰۶۸ھ میں اپنے استاد کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ اور اس وقت اپنی 'صغر سنی' کا ذکر کیا ہے، اس لحاظ سے اس وقت اس کی عمر ۱۳ سال کی فرض کر لی جائے اور دوسری جگہ (ص ۱۵۰) ۱۰۷۷ھ میں اس نے اپنے ''سن تمیز'' کو پہنچنے کا تذکرہ کیا ہے اس وقت اس کی عمر تخمیناً ۲۲ سال کی فرض کر لی جائے، تو اس حساب سے اس کی تاریخ ولادت ۱۰۵۵ھ میں قرار پاتی ہے۔ بہر حال خود مؤلف کی تحریر سے تاریخ ولادت کی تعیین ۱۰۵۰ھ اور ۱۰۵۵ھ کے مابین کی جاسکتی ہے۔

خاندان:

مؤلف کے باپ کا نام علی اسجد خان لودی تھا، جو شہزادہ شجاع کے ساتھ بنگال میں ملازم تھا، اور وہیں اس اس نے ۱۰۸۴ھ میں (۳) شب شنبہ ۱۴ شعبان (۴) کو وفات پائی۔ شیر خان کے چند بھائی

---

(۱)۔ اورئینٹل بایو گریفیکل ڈکشنری ص ۳۸۰ (۲) ص ۱۲۰-۸۵
(۳) ص ۳۴۰ (۴) ص ۱۷۳۔

بھی تھے اور وہ خود سب بھائیوں سے چھوٹا تھا، (۱) ان میں سب سے بڑے بھائی عبداللہ خان نامی نے ۱۰۸۷ھ میں کابل کے پہاڑوں میں جام شہادت نوش کیا۔ (۲) اس کا ایک چچا بھی تھا جس کا نام ناصر خان تھا، اور جس نے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی۔ ابوطالب کلیم سے اس کی دوستی، سوز و نیت طبع، سخن فہمی، نکتہ یابی اور لطیفہ گوئی، کی وجہ سے تھی اس کی ہر دلعزیزی کا تذکرہ مؤلف نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ 'مجموعۂ خوبیہا بود۔' (۳)

اس کا باپ علی اسجد خان بھی ایک ذی علم اور قابل آدمی تھا، جیسا کہ خود مؤلف نے اس سے تحصیل علم کرنے اور اہل علم کے ساتھ صحبت رکھنے کا جابجا تذکرہ کیا ہے۔ (۴)

تعلیم و تربیت:

علی اسجد خان جب بنگال میں شہزادہ شجاع کی ملازمت میں (۱۰۴۸ھ تا ۱۰۶۸ھ) تھا تو اسی زمانے میں شیر خان اپنے دوسرے بھائی کے ساتھ اس کے فیض تربیت سے مستفید ہوتا رہا، اسی اثنا میں جبکہ وہ ہنوز طفل مکتب تھا اس نے ہرات کے ایک فاضل شخص ملا فرخ حسین ناظم سے جو اپنے وطن مالوف سے نکل کر بنگال میں آپڑے تھے، اور جہانگیرنگر یا ڈھاکہ میں مقیم تھے، تحصیل علم شروع کی، اور ابھی فارسی اور عربی کی چند مختصرات پڑھنے پایا تھا کہ ملا صاحب ۱۰۶۸ھ میں عاشورہ کے دن عین حالت نماز سحر میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے، اس کے بعد بنگال میں قحط الرجال کے سبب سے کوئی ایسا معلم اس کو میسر نہ آیا، ان کی وفات کے بعد شیر خان نے کچھ صرف و نحو پڑھی اور اس کے بعد وہ اپنے باپ اور اس کے احباب کے فیض صحبت سے حسب استعداد تحصیل علم کرتا رہا، یہاں تک کہ بیرحم پنجۂ اجل نے ان سب کو اس سے علیحدہ کر دیا، (۵) اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے مؤلف کی تحصیل علم کا زمانہ بہت طویل رہا۔

ملازمت:

باپ اور بھائی کی وفات سے ہمارا مؤلف بہت دل برداشتہ اور پریشان خاطر رہا، اس حالت میں اس کو دور دراز کے سفر پیش آئے اور تکالیف شاقہ برداشت کرنی پڑیں۔ (۶) آخر کو ۱۰۹۰ھ میں شکر اللہ خان فوجدار سرہند کی خدمت میں پہنچا، (۷) جو اس سے لطف و عنایات سے

---

(۱) - ص ۱۲۰ (۲) ص ۳۴۰ (۳) - ص ۵۰ (۴) - ص ۱۰۸، ۱۵۰، ۱۷۲، ۲۰۳ (۵) - ص ۱۲۰ (۶) - ص ۳۴۰ (۷) - ص ۱۳۱

پیش آیا، چنانچہ شکر اللہ خان کی عنایات اور فیض صحبت کے تذکرےمیں مؤلف رطب اللسان نظر آتا ہے - (۱)

علمی و فنی قابلیت :

مؤلف کی علمی قابلیت معلوم کرنے کے لیے اس کی یہ کتاب ایک بہت بڑا ذریعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر علوم و فنون میں اس کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، فن موسیقی کی نسبت خود اس کا بیان ہے کہ معتبر موسیقی دانوں سے نیز اس فن کی کتابوں کے مطالعے سے اس نے خاصی واقفیت حاصل کی تھی علم طب کے مطالعے میں وہ کہتا ہے کہ اس نے کتب طبیہ کا مطالعہ کیا تھا - (ص ۲۶۱)

فن شعر میں اس نے اپنے زمانے کے مشہور شعرا سے استفادہ کیا تھا جیسا کہ اس کی عبارت ذیل سے متبادر ہوتا ہے :

"این مسافر گزرگاہ هستی و مقیم کوئے هیچمدانی راکه بنارسائی رنگ استعداد و فقدان جوهر والا و عدم فطرت بنند داشت در او اخر قرن اول از عمر مستعار قائد شوق کشان کشان بحقایقکده و نزهت‌گاہ تلا میذ الرحمن که فیض پزیران انوار قدسی و مقتبان شعاشع لمعات قدسی اند آورد در اول چندی اعتماد بر حافظهٔ خویش نموده کاغذ را از قلم و قلم را از دست بیگانه می‌داشت و سفینه و بیاض را که در معرض تلف و زوال است لایق محرمیت انگاشت همواره نقوش این کلمات قدسی برلوح سینه ثبت نمودی و به تکرار و تذکارآن مشغوف بودی -" (ص ۳۲۹ - ص ۳۳۰)

لیکن پوری کتاب میں اس کی شاعری کا کوئی نمونہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، سوائے چند اشعار کے جو اپنے باپ اور بھائی کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے لکھے ہیں، یا وہ اشعار جو تتمۂ کتاب میں مرقوم ہیں، لیکن ان کی نسبت بھی یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ خود اسی کے کہے ہوئے اشعار ہیں، لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اتمام کتاب کا تاریخی قطعہ یقیناً اس کا طبع‌زاد ہے -

مؤلف کے طرز تحریر و انشا کا اندازہ مرآة‌الخیال کے محولہ بالا اقتباسات سے بخوبی ہو سکتا ہے -

---

(۱) - ص ۲۳۲

مذهبیت :

مؤلف مذهباً اهل تسنن اور صحیح العقائد معلوم هوتا هے، اس کا مشرب زیاده تر صوفیانه هے، اکثر صوفیاے کرام مثلاً امام ابن العربی رح، امام غزالی رح وغیره بزرگوں کی تصانیف اس کے پیش نظر رهی هیں، اس کے اهل دل هونے کا ثبوت اسی سے ملتا هے که وہ تین بار خواب میں دیدار نبوی سے مشرف هو چکا هے، رویاے صادقه کی مفصل کیفیت اس نے بیان کی هے اور تینوں مرتبه حضور کا اشکال مختلفه میں نظر آنا اس نے لکھا هے، اس کے متعلق کسی بزرگ سے استفسار کیا تو انھوں نے فرمایا که مبتدیوں کو ایسا هی نظر آتا هے مگر جومنتهی هوتے هیں ان کو جمال نبوت اپنی اصلی شکل میں دکھائی دیتا هے (۱)

معاصرین :

مؤلف نے اپنے زمانے کے چند شعرا کے حالات لکھے هیں (۲) اور بعض کے ساتھ اپنے دوستانه تعلقات کا ذکر بھی کیا هے ۔ شکر الله خان کا ذکر اوپر آ چکا هے جو عهد عالمگیری کے حکام میں سے شعر و سخن میں مهارت اور خاکسار تخلص رکھتا تھا، اس کے ساتھ مؤلف کو انتهائی عقیدت هے، چنانچه اس کے فیوض سے متمتع هونے کا تذکره کیا هے (۳)

اپنے عهد کے مشهور اور ممتاز شاعر ناصر علی خان سرهندی کے ساتھ جب که مؤلف سرهند میں مقیم تھا اسکے دوستانه مراسم قائم هو گئے تھے اور اکثر اس کی صحبتوں میں شریک هوا کرتا تھا ۔ چند روز ملاقات نه هو سکی تو ایک مختصر رقعه (۱۲ سطروں کا) ناصر علی کے نام لکھا، جس میں شکایت کی هے که:

'مخمور این شراب دیدار را در شراب انتظار داشتن آئین کجاست و پابند آن سلسله بند محبت را وقف تغافل کردن رسم کدام شهر:

ز هجرت بنوعی جگر خسته ام

که مصداق این بیت بر جسته ام

بر آن نا توان صید بیداد رفت

که در دام از یاد صیاد رفت' (۴)

---

(۱) - ص ۱۸۰ (۲) - ص ۲۲۸، تا ص ۲۶۲ و ص ۲۹۰ تا ص ۳۰۵ (۳) - ص ۲۳۰ (۴) - ص ۲۹۳ ۔

ناصر علی نے اس کا جواب دیا ہے جس میں اپنی عدم فرصت اور پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

ملاذا! سه ماه متصل میگذرد که نیاز مند شما فرصت چشم و اکردنی ندارد که حوادث ناگوار در قد کشیدن و سوانح ناملایم گرم از پے هم رسیدن اند،:

دل غمدیدهٔ دارم مپرس از گرد کلفتها
صدا درکوه چون رگ مانده از سنگینئی آهش'

میرزا محسن ذوالقدر، (ذوالقدر ترکوں کے هاں بے خطا تیر انداز کو کہتے هیں) مؤلف کا معاصرتھا اور اس کےساتھ مدتوں تک اس کے دوستانہ تعلقات رہے تھے اس کی ایک غزل بھی اس نے اپنی کتاب میں درج کی ہے چنانچہ لکھتا ہے ۔

'راقم حروف را بعد از مدتهائے این غزل بخط خود عطافرمود' ۔

اس سے زیادہ مؤلف کے حالات کا پتہ نہیں چلتا اور نہ یہ معلوم هو سکا کہ اس نے کس سن میں وفات پائی' البتہ تاریخ تصنیف کتاب کی بنا پر اس قدر یقینی ہے' کہ وہ ۱۱۰۲ھ تک زندہ تھا ۔

مثنوی آشوبِ ہندوستان

('مندرجہ ذیل مقالہ میرے اس انگریزی مقالے کا ترجمہ ہے جو آل انڈیا اورئنٹیل کانفرس کے اجلاس نہم منعقدہ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۷ء بمقام ٹریوینڈرم(ٹراونکور) کے شعبہ' تاریخ میں پڑھا گیا تھا ۔ اختر ۔)

تمام دنیا کے سلاطین اور فرمان رواؤں میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سے متعلق جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، شاید ہی کسی اور بادشاہ کی نسبت لکھی گئی ہونگی، تاریخ اورنگزیب کے متعدد مآخذ نکلتے چلے آتے ہیں اور ان میں آئے دن ایک نہ ایک اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی سلسلے میں ہم تاریخ اورنگزیب کے ایک ایسے مآخذ کو پیش کر رہے ہیں جس کے موجود و محفوظ ہونے کا اگرچہ ہمیں علم ہے، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے معاصر مورخین میں سے کسی نے اس کو تاریخی مآخذ کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا اور نہ تاریخ عالمگیر کی موجودہ فہرست مآخذ میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے(۱) یہ ایک فارسی مثنوی مسمی بہ 'آشوب ہندوستان، ہے جس پر آئندہ سطور میں تبصرہ کرنا مقصود ہے ۔

مخطوطات :

اس کتاب کے قلمی نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں(۲) میں بہت کمیاب ہیں ۔ عجائب خانہ' برطانوی کے کتب خانے میں

---

(۱) ۔ اورنگزیب کی تاریخ کے تقریباً تمام فارسی مآخذ کے نام سر جدو ناتھ سرکار کی تاریخ اورنگزیب اور پروفیسر نجیب اشرف کے مقدمہ' رقعات عالمگیر میں دیے گئے ہیں جن میں اس مثنوی کا نام نہیں پایا جاتا ۔

(۲) ۔ ہندوستان میں بانکی پور ایشیاٹک سوسائٹی، (کلکتہ)، بوہار، رامپور، علی گڑھ، پشاور، پنجاب یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، ایشیاٹک سوسائٹی (بمبئی) اور یورپ کے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کے کتب خانوں میں اس مثنوی کا کوئی مخطوطہ موجود نہیں ہے ۔

نمبر (۲۶۲۳۵) پر اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جس کا ذکر ڈاکٹر ریؤ نے اپنی فہرست مخطوطات فارسی (۱) میں کیا ہے۔ ۶۰ ورق یا ۱۲۰ صفحات اور ½۵×۱۰ کی تقطیع کا ہے، جس کے ہر صفحے پر ۱۸ شعر لکھے ہوئے ہیں، خط نستعلیق ہے، جس کی نسبت اٹھارھویں صدی کی تحریر ہونے کا قیاس کیا گیا ہے،

انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، اس کا ایک نامکمل مخطوطہ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہے، ان دو مکمل اور ناقص نسخوں کے علاوہ ایک چوتھا مخطوطہ حال میں ہمارے ایک دوست (۲) کے ہاتھ لگا ہے، جس پر اپنے اس مضمون میں تبصرہ کرنا ہے۔

مطبوعہ نسخے:

یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر نایاب ہونے کے باوجود اس مثنوی کے دو مطبوعہ نسخے موجود ہیں، جن میں سے ایک، مطبوعہ ۱۳۰۰ھ کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) کے شعبہ تاریخ فارسی میں نمبر ۹۰۵ پر (۳) جس میں مصنف کا نام 'بہشتی شیرازی، بتایا گیا ہے، اور دوسرا نسخہ مطبوعہ ۱۸۸۳ء لاہور کی پبلک لائبریری میں بتایا جاتا ہے، (۴) یہ دونوں مطبوعہ نسخے ایک ہی اشاعت کے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ہجری اور عیسوی سنہ ایک دوسرے سے مطابق پائے جاتے ہیں۔

ہمارامخطوطہ:

یہ چھوٹی سی جلد ۵×۸ کی تقطیع پر ۸۷ اوراق یا ۱۷۴ صفحات کی کتاب ہے۔ ہر صفحے میں ۱۵ اشعار ہیں کل اشعار کی تعداد

---

(۱)۔ جلد دوم صفحات ۶۸۹-۶۹۰۔ (۲)۔ جناب عبدالرحمن خان صاحب پٹھان (علیگ) ناظر، ساجد و اوقاف ریاست جونا گڑھ (۳) فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد ۱ ص ۲۵۲۔

(۴)۔ کتب خانہ آصفیہ میں جا کر ہم نے اس مطبوعہ نسخے کی تلاش کی، مگر وہ وہاں سے غائب تھا، اسی طرح لاہور کے کتب خانے میں بھی وہ ہمیں نہ ملا۔

دو هزار پانچ سو ستر ہے، ہر صفحے پر سیاہ و سرخ لکیروں کی جدولیں ہیں، عنوانات تمامتر سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، کتاب خوش خط اور نستعلیق ہے، خط بہت پختہ اور صاف ہے' بعض اشعار میں الفاظ کو کاٹ کر حاشیے پر ان کی تصحیح کی گئی ہے غالباً مالک کتاب یا کسی پڑھنے والے نے کسی دوسرے نسخے سے اس کی تطبیق کر کے تصحیح کی ہو گی، ہر صفحے کے آخر میں آیندہ صفحے کا ایک لفظ لکھدیا گیا ہے' صفحات کا نشان نہیں دیا گیا، کتاب کا نام سرورق، اول یا آخر کتاب میں نہیں لکھا گیا، بلکہ مثنوی کے اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے:

شد این نامه از همت دوستان
مسمی 'بآشوب هندوستان'

تاریخ کتابت اور کاتب کا نام عبارت مندرجہ ذیل سے معلوم ہوتے ہیں جو آخر کتاب میں درج ہے :

'کاتب الحروف محمد حسین بیست و هشتم شهر رجب المرجب ۱۰۹۷ھ تحریر یافت ـ'

اس مثنوی کی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ ۱۰۶۸ھ اور ۱۰۶۹ھ کے مابین لکھی گئی ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ تصنیف کتاب کے صرف ۲۸ برس بعد لکھا گیا ہے ـ

آخر کتاب میں حاشیے پر لکھا ہے 'ایں کتاب دولہ رائے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ دولہ رائے کی ملکیت میں تھا جو جوناگڑھ کے ایک ذی علم برہمن چھتری اور دیسائیوں کے خاندان سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے گزرے ہیں ـ

مصنف :

اس مثنوی کے مصنف کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکا، سوائے اس کے کہ اس کا تخلص " بہشتی،، تھا جو اس کتاب میں مندرجہ

ذیل اشعار میں پایا جاتا ہے :

۱ - خدایا بہشتی ثناخوان تست
گیاہی ضعیفی زبستان تست

۲ - بہشتی کند گر صفاتش بیان
چو تیغش ز پولاد باید زبان

۳ - بہشتی بمدح امام ز من
چو صاحب‌سخن کرد ختم‌سخن

اس عہد کے فارسی شعرا کے تذکروں میں بھی اس کا کہیں پتہ نہ مل سکا، مطبوعہ نسخہ' مثنوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ایرانی‌الاصل اور شیراز کا رہنے والا تھا۔ وہ مذہباً شیعہ اور اثنا عشری معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اس کے اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے :

علی ولی اولیا رادلیل
نبی را وصی و خدا را وکیل
بمدح امامان اثناعشر
مرا ساز نخل بیان بارور

اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشتی شہزادہ مراد بخش کا درباری شاعر تھا ، اس کی مدح میں اشعار لکھا کرتا تھا، چنانچہ اس مثنوی میں ایک جگہ کہتا ہے :

بوصف حسینان مده فرصتم
که از بیهوده در ز حمتم
مراد جهانست چوں سرورم
ز خود کرد لطفش ثنا گسترم

پہلے شعر میں 'وصف حسیناں، سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غزلیات بھی لکھتا تھا، جو شعر اے عجم کا عام طور سے مشغلہ رہا ہے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس نے اپنی ایک کلیات بھی یادگار چھوڑی ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ اڈنبرا کے کتب خانے میں محفوظ ہے،

شہزادہ مراد بخش کی سر پرستی میں رہ کر بہشتی اپنے آقائے ولی نعمت کی مدح و ثنا میں رطب‌اللسان نظر آتا ہے، کبھی تو اس کو 'مراد جہاں' کے لقب سے یاد کرتا ہے اور کبھی 'مراد دو عالم' کہہ کر پکارتا ہے، مثلاً :

ز آل تمر شاہ گیتی ستاں
نیامد شہی چون مراد جہاں

جیسا کہ مثنوی لکھنے والوں کا عام دستور ہے مصنف نے کتاب کے شروع میں مراد کی مدح کا خاص عنوان قائم کر کے اپنے دیگر هم پیشہ مدح سراؤں کی طرح اس کی جا و بیجا مدح و ستائش کی ہے، چنانچہ مراد بخش کی مذہبیت سے متعلق مصنف ہمیں صرف پہلی مرتبہ روشناس کراتا ہے :

ز عصیان گریزان ز طاعت قرین
بود پے سخن شاہ دنیا و دین
دلش غنچۂ گلشن معرفت
ز شاہان ندارد کسی این صفت
شب و روز برسنت مصطفیٰ
بہر کار شرعش بود رہنما
چنان شرع دارد بعہدش رواج
زادیان باطل ستاند خراج

لیکن تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مراد ایک سپاہی منش اور سرکش طبیعت کا آدمی تھا ۔ وہ عیش و عشرت کا طالب اور زیادہ تر اپنا وقت عیش پرستی اور لہو و لعب میں گزارتا تھا، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ سنت نبوی کا پیرو اور احکام شریعت کا پابند تھا، اس کے سوائے شاعرانہ مبالغہ کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔

خود مصنف کا بیان ہے کہ اس نے اپنے آقائے ولی نعمت کے حالات میں ایک قرن (غالباً دس سال) کے اندر کئی چیزیں تصنیف کی تھیں

اور 'آشوب ہند' اس کی پہلی تصنیف نہیں ہے :

ز احوال آں قبلہ راستان
ز یک قرن گفتم بسی داستان
کنون فکر تصنیف دیگر کنم
ز آشوب گیتی سخن سر کنم

تمام لڑائیاں اور دیگر واقعات جو شاہجہان کے چاروں شہزادوں کے مابین تخت دہلی کے حصول کے لیے رونما ہوئے، ان کی نسبت مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ سب اس کے چشمدید ہیں، چنانچہ شاہنامہ سے اپنی مثنوی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنے تئیں فردوسی پر ترجیح دیتا ہے، کہ جس نے اپنے مشاہیر کے کارناموں اور لڑائیوں کا بیان اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر قلم بند کیا ہے :

بسی سال فردوسیٔ خوش کلام
که بادش زیزداں درود و سلام
همه رزم شهنامه نادیده گفت
بجاے گہر طبعش الماس سفت
من این رزمہارا همه دیده ام
ز کس همچو افسانه نشنیده ام
چو افسانه کذبست شیریں تراست
ولی صدق را نشأة دیگراست

کتاب میں بعض اشارات ایسے پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف گجرات میں رہ چکا ہے۔ اولاً یہ امر یقینی ہے کہ وہ مراد کا درباری شاعر تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت مراد احمد آباد میں تھا جہاں اسنے ''مروج‌الدین،، کا لقب اختیار کر کے تخت نشینی کی رسم ادا کی تھی، ثانیاً وہ علامہ طوسی (خواجہ نصیر الدین) کی ایک پیشین گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گجرات سے کچھ لوگ حج کو گئے تھے، وہ اسی سال واپس آ ے، چنانچہ ان کی زبانی یہ واقعہ سنا، وغیرہ، ان دونوں باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر چہ احمد آباد میں اس کا مستقل قیام نہ رہا ہو، لیکن وہ کم از کم اتنے عرصے تک وہاں مقیم رہا ہو گا جب تک کہ شہزادہ مراد بخش گجرات میں تھا۔

تاریخ تصنیف :

اس مثنوی کی تصنیف کا ذکر متن میں کہیں نہیں ملتا، البتہ بعض تاریخی واقعات جو بیان کیے گئے ہیں ان کی بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ۱۰۶۸ھ اور ۱۰۶۹ھ کے مابین لکھی گئی ہو گی، اولاً یہ کہ مراد کی وفات کا ذکر اس میں نہیں کیا گیا، صرف اس کو قید کر کے گوالیار کے قلعے میں بھیج دینے کا حال درج ہے، جو ۴ شوال ۱۰۶۸ھ کو واقع ہوا، ثانیاً کتاب کے آخر میں دارا شکوہ کی گرفتاری اور اس کے قتل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جو ۲۱ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ کو پیش آیا، ان قرائن کی بنا پر ۱۰۶۹ھ یا ۱۰۷۰ھ کو اس کتاب کی تاریخ تصنیف سمجھنا چاہیے، یعنی مراد کی وفات سے بہت پہلے اور دارا کے قتل کے فوراً بعد۔

فہرست مضامین :

موجودہ نسخے میں سرخ روشنائی سے حسب ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں، جن کو ہم علی‌الترتیب یہاں نقل کرتے ہیں :

(۱) دیباچہ حمد و نعت و منقبت۔

(۲) در مدح سلطان شاھجہان (یعنی مراد)۔

(۳) در مدح شاھجہان و بخش کردن ولایت بچہار فرزندان خود۔

(۴) گفتار اندر احداث مرض به بدن مبارک شاھجہان۔

(۵) در تدبیر ساختن دارا شکوه برزم شجاع و فرستادن پور خود، برزم شجاع بطرف بنگاله۔

(۶) حکایت در تمثیل۔

(۷) آگاهی یافتن سلطان مرادبخش از مرض شاھجہان بادشاه و کشتن علی تقی وزیر خودرا۔

(۸) بیان تسخیر قلعهٔ ارک به بندر مبارک (سورت) بدست آمدن مال بسیار از تدبیر شاه باز۔

(۹) گفتار اندر جلوس فرمودن مراد بخش در صوبهٔ گجرات۔

(۱۰) فرستادن دارا شکوه پور خود را بدفع شاه شجاع و منصور گردیدن سلیمان شکوه و هزیمت شاه شجاع مرتبه اول۔

(۱۱) لشکر کشیدن سلطان مراد بخش از احمد آباد بصوب اجین و دیدن سلطان اورنگزیب۔

(۱۲) گفتار اندر بزم کردن اورنگزیب و مراد بخش۔

(۱۳) مصاف انداختن اورنگزیب و سلطان مراد بخش بمقابلہ مہاراجہ (جسونت سنگھ) و ہزیمت یافتن او۔

(۱۴) لشکر کشیدن ہر دو شہزادہ بطرف اکبر آباد براہ سماتگر (سموگڑھ)۔

(۱۵) مظفر گشتن سلطان مراد بخش و اورنگزیب و شکست دارا۔

(۱۶) مفتوح شدن قلعہء ارک اکبرآباد و مقید شدن مراد بخش بدست اورنگزیب۔

(۱۷) ہزیمت دارا شکوہ از لاہور بموجب ناسہاے کید کہ بامرآے داراشکوہ رسیدہ بودند و آخر بد گمان شدہ مرتبہ دویم گریخت:

(۱۸) ہزیمت شاہ شجاع و فتح اورنگزیب در رخصت شدن لشکر۔

(۱۹) لشکر کشیدن دارا شکوہ احمد آباد بطرف اجمیر بہ تدبر مہاراجہ و آخر الامر شکست یافتن و مرتبہء سیوم گریختن و بدست جیون زمیندار لاہور مقید گردیدن و آخر کشتہ شدن۔

عنوانات بالا کے تحت میں مصنف نے واقعات اور ان کی تفصیلی جزئیات بیان کی ہیں، اور یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس نے ان واقعات کو بیان کرنے میں شاعرانہ مبالغہ اور خیال آرائی سے کام نہیں لیا۔

تاریخی اہمیت:

معاصر ہونے کے اعتبار سے مصنف کی معلومات کچھ ذاتی واقفیت اور کچھ سنی سنائی خبروں اور رپورٹوں پر مبنی ہیں، ا ور جہاں تک برادرانہ معرکہ آرائیوں کا تعلق ہے، یہ کتاب ہمعصر تواریخ کے مقابلے میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، اگرچہ واقعات مندرجہء کتاب عام طور پر اس زمانے کی نیز مابعد کی تواریخ میں ملتے ہیں، تاہم مصنف کا یہ عام دعوی کہ یہ تمام لڑائیاں اس کی چشمدید ہیں قابل قبول نہیں ہو سکتا، یہ صحیح ہے کہ وہ مراد کے دربار سے وابستہ تھا اور اس لحاظ سے مراد کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ اس کے چشمدید ہوں، لیکن یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں جو واقعات پیش آئے ان کو بھی اس نے بچشم خود دیکھا تھا، قدرتی طور پر یہ سب معلومات اس کو پرچہ نویسوں یا افواہوں اور خبروں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہوں گی، بااین ہمہ اس کے بیانات دوسری معتبر تواریخ کی مطابقت میں اکثر صحت سے قریب تر ہیں۔

اورنگ زیب کی نسبت رائے:

مصنف مراد کا نوکر اور اس کا طرفدار تھا، اس اس لیے طبعاً اس کو اورنگزیب کا مخالف ہونا چاہیے، لیکن پوری کتاب میں اس نے اورنگزیب کے خلاف کچھ لکھنے سے بڑی احتیاط برتی ہے، شاہجہان کے اپنے چاروں بیٹوں کو چار ولایات (صوبے) تقسیم کرنے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے چاروں شہزادوں کو خلفائے راشدین سے تشبیہ دی ہے:

خلف بردش از دولت ذوالمنن
چو اصحاب خیر البشر چار تن
بداراشکوه جهان اقتدار
سریرش سزا وار صدیق وار
بآئین فاروق سلطان شجاع
ز خورشید رایش فروزان شعاع
همی بود شهر شهزاده اورنگ زیب
چو عثمان سراپا حیا و شیکب
ز سلطان مراد از نکو اختری
عیان شوکت وصولت حیدری

مصنف کا اورنگزیب کو حضرت عثمانؓ سے تشبیہ دینا قابل لحاظ ہے کہ اس سے ہمارے اس شیعی شاعر کا رجحان اورنگزیب کی طرف ظاہر ہوتا ہے، جس کو اس نے اس طنز پنہاں کے پردےمیں چھپایا ہے، دوسری طرف وہ اپنے سرپرست مراد کو حضرت علیؓ سے مشابہت دیتے ہوئے نہ صرف اس کو دوسروں پر فضیلت بخشتا ہے، بلکہ اس طرح وہ امام ممدوح کو خراج فضیلت پیش کرتا ہے، بہر حال یہ مشابہت بالکل بیجا اور نامناسب ہے، اور مصنف نے اس پردے میں اورنگزیب کے خلاف اپنے مذہبی بغض و عناد کو چھپایا ہے، بعض اور مقامات پر بھی اس نے اورنگزیب کے خلاف زہر اگلا ہے، لیکن ایسا کرنے میں اس نے بڑی احتیاط سے کام لے کر دوسروں کی زبانی ان خیالات کو ادا کیا ہے، صرف ایک جگہ شجاع کے سپہ سالار اللہ وردی خاں کو لالچ دےکر اپنی طرف کر لینے پر وہ اورنگزیب کے خلاف علانیہ طور پر لکھتا ہے:

چو اکثر فتوحات اورنگ زیب
بسحر و فسوں بود و مکر و فریب

بااین ہمہ وہ اورنگ زیب کی دور بینی اور حکمت عملی کا بڑا معترف اور مداح نظر آتا ہے، چنانچہ رقمطراز ہے :

ز تدبیر و فرهنگ اورنگ شاه
که از کودکی داده بودش اله

اسی طرح مراد کے قید ہو جانے کا ذکر کرتے ہوے اور مراد اور اورنگزیب کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے، کہ کسی بادشاہ کے چاروں طرف کئی دشمن ہوں تو اس کے لیے مکر و تدبیر سے کام لینا جائز ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے :

شہے را که بسیار باشد عدو
به نیرنگ و افسوں کند کار او
کند زادهٔ شاه شاهنشہی
گر از کار خود باشدش آ گہی
نه آنکس که مانند سلطان مراد
ز انجام کارش نیارد بیاد
بدانساں که رستم تهور نداشت
سکندر ز تختش علم برفراشت

مراد کے قید ہو جانے کے بعد سے اس بات کا ذکر کرتے ہوے کہ دریاے اٹک سے لے کر سلک دکن تک تمام ملک اجاڑ اور ویران ہو گیا ہے، مصنف کے یہ اشعار اورنگ زیب کی نسبت بہت معنی خیز ہیں :

مگر بعد ازیں نیت شهریار
جهاں را کند سر بسر عیش زار
بخیر است چوں نیت پادشاه
چو جوهر ز پولاد روید گیاه

مراد سے اگرچہ مصنف کو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر کافی همدردی ہے اور وہ اس کی فیاضی شجاعت اور مردانہ اوصاف کا بہت مداح ہے لیکن حکومت و ریاست کے لیے وہ اس کو قابل اور موزوں نہیں سمجھتا، اس معاملے میں وہ اورنگ زیب کی نسبت بہت بلند راے رکھتا ہے۔

دارا کے طرف دار مہاراجہ جسونت سنگھ کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کے لئے اورنگزیب مراد کو پیغام بھیجتا ہے، اور دارا کی شکست ہو جانے پر اس وسیع سلطنت کا فرمان روا بنانے کا وعدہ کرتا ہے، پیغام ملتے ہی مراد احمد آباد روانہ ہو جاتا ہے، اور دل میں یہ منصوبے گانٹھ رہا ہے کہ دارا کے استیصال کے بعد وہ تخت دہلی پر متمکن ہو گا :

گماں اینکه دارا چو یابد شکست
بر اورنگ دهلی بخواهد نشست

اس موقع پر مصنف ایک تجربہ کار سیاست داں کی طرح لکھتا ہے کہ:

ندانست باآں همه رای و هوش
که بی نیش کس را ندادند نوش
چه خوش گفت رند تنک مایه
که هر کار را هست پیرایه

اسی سلسلے میں مصنف مراد کے لشکر کے رذیل افسروں کی نالائقی اور بدکرداری کی شکایت کرتے ہوئے لکھتا ہے :

بود از وزیران دوات و قلم
زشه عدل و تدبیر و فوج و حشم
چو ارکان دولت اراذل بود
حق پادشه جمله باطل بود
بنوعی که بود از مراد جهان
شود شرح آں در مجالس بیان

جگت سنگھ کے خلاف حملہ آور ہونے اور بلخ و بدخشاں پر لشکرکشی کرنے کے لیے مصنف نے مراد کی بڑی تعریف کی ہے، اس کے باوجود وہ اس کو تخت زرین پر بیٹھنے اور تاج شاہی پہننے کے قابل نہیں سمجھتا، مراد نے اپنے حریف اورنگزیب کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کا جو غیر سیاسی اقدام کیا اس پر مصنف اس کو اس طرح سلامت کرتا ہے :

بالآخر سپهر برین شاد شد
که فرماں ده احمد آباد شد
و لیکن شهنشاه با عقل ورای
همه لطف و احسان بخلق خدای

ندانست این نکتهٔ دلپذیر
که کار شبان نیست تیمار شیر
ز اولاد هرکس که بخت آور است
همان لائق تاج و تخت زر است
بود دور از شیوهٔ خسروی
که دعوی‌اگر ملک گردد قوی

مصنف نے اس مثنوی میں بعض واقعات ایسے لکھے ھیں جو عام تاریخوں میں نہیں پائے جاتے، مثلاً :

۱ - دارا شکوہ کو قید کیا، اس وقت اس کی بڑی شہزادی نے جگ جیون زمیندار لاھور کے پاؤں پڑکر باپ کی رھائی کی استدعا کی، مگر اس گستاخ شخص نے اس کے نازک چہرے پر تھپڑ مار دیا ۔ اس واقعے کو اس نے دردناک پیرایے اور شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ھے :

سہیں دخت آں شاہ والا جناب
که خورشید و ماهش ندیده جواب
چو هنگامهٔ قید دارا شنید
چو آهنگ از پرده بیرون کشید
چه غنچه پر از شکوه خونین دهن
چو گل چاک چاک‌کش به‌تن پیراهن
چو آن که گل بر خاک افتد ز باد
بدانگونه در پاے جیون فتاد
بزاریش گفتا که اے سنگدل
ز حق ناشناسی‌ست شیطان خجل
خوش آنکس که از مرحمت بگزرد
بدشمن کسی دوست رابسپرد
بدارا کسے بعد ازین نکرود (؟)
رها کن بهر جا که خواهد رود
مرا با زرو زینت بے شمار
بسلک کنیزان مطبخ در آر

مرادخت‌پرویز شه مادر است
پدر آل تیمور صاحب فراست
بدینساں بجانت کنیزم نمائی
زپا بندزنجیر دا را کشای
نمود آں پری هر قدر ناله بیش
نشد رنجه آں‌دیوزافغان خویش
زبے سهری و سنگ جانی نمود
رخے همچو ماهی بسیلی کبود

۲ - دارا کے قتل کے سلسلے میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ قاتلوں نے پہلے اس کو جام زہر پیش کیا، مگر اس نے پینے سے انکار کر دیا :

رساند ابتدا قاتلش جام زهر
که در کش بحکم شهنشاه دهر
ابا کردو گفتا مرا از نخست
بود باخدا اعتقادم درست
مسلمانم و پیر من مصطفے
چو کفار جاں را سپارم چرا
شده سرد از زندگانی دلم
بهر نوع دانی بکن بسملم؛

۳ - عالمگیر نے دهلی میں رسم تخت نشینی ادا کی، اس کے چوتھے روز منظر عام میں نکل کر بخشیوں سے کہا کہ فوج میں جتنے قدیم ملازم ہوں سب برخاست کر دیے جائیں اور ان کی جگہ نئے آدمی بھرتی کیے جائیں :

چو روز چهارم گزشت از جلوس
رخ لشکر از درد شد آبنوس
بر آمد چو بر منظر خاص و عام
بفرموده با بخشیان عظام
که باید سپاه جدیدی همه
شوند از قدیمی جدا چوں رمه

ان قدیم نوکروں سے وہ لوگ مراد ہیں جو شاہجہان، دارا اور مراد کے لشکر میں تھے :

ز شاہجہان و ز داراشکوہ
ز سلطان‌مراد تہور پژوہ
سپہ ہر قدر ہست در ہر طرف
نمایند از نوکری بر طرف

اس اچانک برطرفی سے لوگوں میں کس قدر تہلکہ مچ گیا اور ہزاروں آدمی بے روزگار ہو گئے اس کی نسبت مصنف لکھتا ہے :

بسے راہم از نوکری دور ساخت
ہمہ صبح شاں شام دیجور ساخت
بعہدش پریشان و بی‌روزگار
نشستند چندیں ہزاراں ہزار
ز اولاد صاحب قراں ہیچ شاہ
نبود ایں چنیں مہرباں با سپاہ

بعد میں مصنف یہ دعا کرتے ہوئے کہ خدا اس کو عدل، خلق اور سخاوت عطا فرمائے، دولت سے محبت رکھنے پر عالمگیر کو ملامت کرتا ہے :

خدایش دہد عدل و خلق وسخا
کہ آسودہ باشند خلق خدا
شہی را کہ دردل بود مہر زر
چو زر دولتش رودہد یک دگر
ازاں‌ماجرا دم نباید زدن
بہ بینم کہ آخر چہ خواہد شدن

یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب مراد قید ہو چکا تھا، شجاع بھاگ کھڑا ہوا تھا، اور دارا شکوہ قتل کر دیا گیا تھا، اور ان سب کی فوجوں کے سپاہی اورنگزیب کی فوج میں جمع ہو گئے تھے، اس واقعے کی

صحت میں کلام ہے، اس لیے کہ کسی تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی تاہم اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ عالمگیر کا ایک دانشمندانہ فعل ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے حاسدوں اور جان لیوا دشمنوں کے طرفدار ملازموں کو نکال کر اپنے تئیں خطرے سے محفوظ کر لیا۔ واقعی شہنشاہ کے اس دور اندیشانہ سیاسی تدبر کی داد دینی چاہیے، جو اس کو قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی عالمگیر کے بھائیوں کی جنگ سے متعلق بعض جزئیات و تفصیلات کے لحاظ سے، جو مصنف کی چشمدید اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں، ایک مفید اور قابل استعمال ذریعہ ہے، اور تاریخ اورنگزیب کے قدیم مآخذ میں ایک معاصرانہ اضافہ ہے جو اب تک غیر معروف رہا ہے اور روشنی میں نہیں لایا گیا۔

فتوح السلاطین از عصامی (۱)

فارسی زبان میں سب سے پہلے فردوسی نے شاہ نامہ لکھ کر شاہان ایران کی افسانہ نما تاریخ کو نظم میں لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا شاہ نامہ اس قدر مقبول ہوا کہ وہ فارسی کے کلاسیکی ادب میں اپنی سلاست اور خالص فارسی زبان کی وجہ سے بے نظیر مانا گیا۔ اس کے بعد نظامی گنجوی نے شاہ نامہ کے انداز پر سکندر نامہ اور دوسری چار عشقیہ اور صوفیانہ مثنویاں لکھیں جو 'خمسۂ نظامی' کے نام سے مشہور ہیں۔ نظامی کے تتبع میں شعرائے ایران نے بے شمار مثنویاں تصنیف کیں۔ ہندوستان میں سب سے پہلے خواجہ امیرخسرو نے نظامی کی تقلید میں متعدد مثنویاں لکھیں جو عام طور پر مشہور ہیں۔ ان مثنویوں میں 'خزائن الفتوح'، 'تغلق نامہ'، اور 'قران السعدین' ہندوستان کے بعض فرمانرواؤں کی منظوم تاریخیں ہیں۔ امیر خسرو پہلے شاعر ہیں جنھوں نے سلاطین ہند کی منظوم تاریخیں تصنیف کیں۔ خسرو کے بعد انھی کے ایک ہمعصرہندوستانی شاعر نے نظامی کے تتبع میں 'فتوح السلاطین' کے نام سے ایک ضخیم تاریخ شاہ نامہ اور سکندر نامہ کے طرز پر لکھی جو سلاطین ہند کی فتوحات کی منظوم تاریخ ہے۔ اگرچہ طباطبائی نے تاج المآثر میں، مورخ فرشتہ نے اپنی تاریخ گلزار شاہی میں، اور نظام الدین احمد نخشبی نے طبقات اکبری میں اس کا ذکر کیا ہے، بلکہ اول الذکر دو مورخوں نے اس کتاب سے نقل بھی کیا ہے، پھر بھی اس کی کم یابی نے اس کو اب تک عام نظروں سے پوشیدہ رکھا۔ چنانچہ یہ کئی صدیوں تک غیر معروف رہی اب تک اس کتاب کے صرف دو نسخے دستیاب ہوئے ہیں جن سے تصحیح و مقابلہ کر کے سید یوشع صاحب لکچرار مدراس یونی ورسٹی نے

---

(۱) - نسخۂ مرتبہ سید محمد یوشع صاحب بی، اے۔ لکچرار فارسی، یونی ورسٹی مدراس پر تبصرہ۔

اس کا ایک صحیح متن تیار کیا اور حال ھی میں مدراس یونیورسٹی نے اپنے سلسلہٴ مطبوعات اسلامی میں اس کو شایع کر دیا ھے۔

اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ھے کہ اس کتاب کو ڈاکٹر آغا مہدی حسین ۱۹۳۸ء میں شایع کر چکے ھیں۔ ۱۹۳۳ء میں محمد بن تغلق پر تحقیقی مقالہ لکھتے وقت آغا صاحب کو انڈیا آفس کے قلمی نسخوں کی فہرست میں فتوح السلاطین کے ایک قلمی نسخے کا ذکر ملا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دو سال پہلے وہ نسخہ مدراس یونیورسٹی کو بھیج دیا گیا ھے۔ مہدی حسین صاحب کے کہنے پر وہ نسخہ واپس منگوایا گیا، لیکن وہ اس وقت پہنچا جب مہدی صاحب اپنا مقالہ ختم کر چکے تھے۔ انگلستان سے واپسی پر انھوں نے یہ نسخہ آگرہ میں منگوالیا اور اکتوبر ۱۹۳۶ء سے اپنا کام شروع کردیا۔ ڈیڑھ برس کی مسلسل محنت کے بعد اس نسخے کو قابل اشاعت بنایا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں یہ حلیہٴ طباعت سے آراستہ ھوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو برقی پریس آگرہ میں لیتھو میں چھپوایا ھے، طباعت اور کاغذ معمولی قسم کے ھیں، انڈکس وغیرہ ندارد۔ مہدی حسین صاحب کے پاس صرف انڈیا آفس والا نسخہ تھا جس کے باعث ان کے مطبوعہ متن میں کئی اشعار اور مصرعے غائب ھیں اور غلطیوں کی تعداد بھی کافی ھے۔ کل اشعار ۱۱۵۱۶ ھیں۔ شروع میں ایک چھ صفحوں کا اردو دیباچہ ھے اور آخر میں ۵ صفحات کا ایک انگریزی مقدمہ، جن میں کتاب اور مصنف کا مختصر احوال لکھا ھے۔ لیکن مہدی حسین صاحب سے پیش‌تر مدراس یونی ورسٹی کے ایک قابل اور ہونہار لکچرار سید یوشع صاحب اس کتاب کو مرتب و مدون کر چکے تھے، اور اپنی موجوہ اشاعت سے دس سال پہلے انھوں نے اس کتاب اور اس کے مصنف کے حالات پر 'عصامی نامہ' کے نام سے فارسی میں ایک منظوم رسالہ لکھا تھا جو ۱۹۳۷ء میں شایع ھو چکا ھے۔ مہدی صاحب نے بھی اپنے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ھے۔ یہ ۳۸ صفحات کا ایک رسالہ ھے جس‌میں عصامی کے مختصر حالات، سبب تالیف کتاب، موضوع کتاب، اور اس کی خصوصیات کو فارسی نظم میں عصامی کی اختیار کردہ بحر میں لکھا گیا ھے۔ اس لحاظ سے فتوح السلاطین کو سب سے پہلے روشناس کرانے کا فخر سید یوشع صاحب کو حاصل ھے۔ ان کے مرتب کردہ متن کے مقدمہ اور عصامی نامہ کے دیباچے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ھے کہ انڈیا آفس

کے نسخے کے علاوہ اس کتاب کا ایک دوسرا نسخہ بھی ان کو حیدرآباد دکن کے مولوی محمد غوث صاحب کے پاس سے دستیاب ہوا تھا۔ جس میں انڈیا آفس کے نسخے سے تقریباً دو سو اشعار زائد تھے۔ یوشع صاحب کا مرتب کردہ متن شایع کرنے میں مدراس یونی ورسٹی نے دس سال صرف کر دیے، اور آخر کار گزشتہ سال یہ کتاب مدراس یونی ورسٹی سے شائع ہو گئی۔ اگرچہ آغا مہدی حسین اس کو واحد نسخے سے مرتب کر کےسنہ ۳۸ء میں شایع کر چکے تھے، جس میں کئی غلطیوں کی تصحیح نہیں ہو سکی، باین‌همه یوشع صاحب الفضل للمتقدم کے مصداق ٹھہرتے ہیں، اور ان کے مطبوعہ نسخے کو آغا صاحب کے مرتبہ متن پر اس وجہ سے سبقت حاصل ہے کہ یہ اس سے پہلے ہی دو نسخوں سے تصحیح و مقابلہ کے بعد مرتب ہو چکا تھا۔ اشعار کی زیادہ تعداد صحت اور ترتیب وغیرہ کے اعتبار سے بھی یہ نسخہ مہدی صاحب کے نسخے سے بدرجہا بہتر اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ ۶۱۸ صفحات کا یہ نسخ ٹائپ میں دبیز کاغذ پر چھپا ہوا ضخیم مجلد علمی و تاریخی تحقیق کا قابل قدر نمونہ ہے جس کی تصحیح ترتیب اور تہذیب میں مرتب نے کافی محنت کی ہے اور ہر طرح سے اسے بہترین اشاعت بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس اشاعت کی قابل ذکر خصوصیات کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ مرتب کی محنت اور تحقیق کا صحیح اندازہ ہو سکے:

۱۔ شروع کتاب میں سید یوشع صاحب کا ایک ۱۲ صفحوں کا مقدمہ فارسی زبان میں ہے جس میں انھوں نے مصنف کے مختصر حالات، سبب تالیف کتاب، اور کتاب کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے، اور سند میں کتاب کے اشعار جابجا نقل کیے ہیں، اس کے بعد کے تین صفحوں میں صفحات کتاب کے حوالے سے ان حواشی کا ایک ضمیمہ دیا ہے جو ذیلی حواشی میں درج ہونے سے رہ گئے تھے۔

۲۔ مقدمہ کے بعد ایک طویل فہرست مضامین دی ہے جو حروف ابجد میں ابجد سے قرشت تک یعنی ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۱) اس فہرست میں وہ تمام عنوانات درج کیے گئے ہیں جو کتاب کی ہر فصل پر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اصل کتاب کا متن ہے جو ۶۱۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

---

۱ - ۲۲ ہونے چاہیں'

۳ - آخر میں فہرست اسمائے رجال و امکنہ ہے جو ص۶۱۹ سے ص ۶۵۷ تک ہے - ۶۵۸ پر ان کتابوں کی مختصر فہرست ہے جن کا نام متن کتاب میں یا حواشی میں کہیں آیا ہے -

۴ - ص ۶۵۹ تا ۶۶۲ ان تمام سلاطین کی ولادت ، وفات، جلوس اور فتوحات کے سنین مطابق سنہ ہجری و عیسوی مع حوالہٗ صفحات متن دیے ہیں -

۵ - ص ۶۶۳ - ۶۶۴ میں ملکی عہدوں اور منصبوں کی فہرست دی ہے جن کا ذکر مصنف نے متن کتاب میں کیا ہے ، اور زیادہ تر فارسی زبان کے الفاظ ہیں - ان میں ترجمان، دبیر، حاجب، خازن، قاضی، وزیر، مفتی، اور نقیب کے علاوہ جو عربی ہیں، کچھ تو فارسی کے ہیں اور بقیہ تمام تر ترکی زبان کے الفاظ ہیں جو ترک اور مغل سلاطین ہند کے عہد میں رائج ہو چکے تھے - اگر ان ترکی اور فارسی منا سب کے بالمقابل ان کے معنی اور مترادفات بھی لکھ دیے جاتے تو معلوم ہو سکتا کہ یہ کون کون سے عہدے تھے - اگرچہ بعض عہدے مثل سپہ سالار، امیر شکار، قلعہ دار، فوجدار، میرآخور، کوتوال وغیرہ عام طور پر معلوم ہیں لیکن اخربک، باربک، بارگی دار، پایک، ترغائی، جاندار، دزبان، سہم الحشم، غمخوارا شکرہ، قمری بک، وغیرہ کی نسبت ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے کہ یہ کون سے عہدے تھے - ان کی تشریح کر دینی ضروری تھی -

۶ - اس کے بعد مشکل الفاظ کتاب کی فرہنگ ہے جو صفحہ ۶۶۴ سے صفحہ ۶۷۸ تک آئی ہے، اگرچہ اس فرہنگ میں مشکل الفاظ کے معنی بحوالہٗ صفحات متن تفصیل سے دیے گئے ہیں، لیکن بعض الفاظ اس میں ایسے بھی ہیں جن کا شمار الفاظ میں نہیں ہو سکتا، مثلاً : آبستن، آسان، آوارہ، ابجد، ابرار، التزام، البتہ، امرد، انبار، اوج، اہل قلم، باطل، بانگ، بہرہ، بیت مال، بےغرض، پست، پنبہ، پیکر، تحفہ، خلا، رخصت، سرکش، شیوہ، فرصت، فراہم، فتنہ، منظر، نسیان، نماز، نمونہ، نواحی وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ عام طور پر فارسی زبان اور اردو میں بھی مستعمل ہیں جن کو فرہنگ میں دینے کی ضرورت نہ تھی - بعض الفاظ پر غلط اعراب لگائے گئے ہیں، مثلاً، مکر مت کو مکرست بالضم، معبد کو معبد بالضم (بمعنی معبود) نقل کو نقل بالضم وغیرہ -

ان الفاظ میں بعض ھندی لفظ بھی آ گئے ھیں جو حسب ذیل ھیں :

بن ۔ جنگل
تھال ۔ طبق
تھانہ۔مرکز فوج کہ دردیہات متعین‌باشد
جوگی ۔ درویش و قلندر

جوھر ۔ اھل قلعہ کا اپنے زن و فرزند کو جلا دیناجب کہ مقاوست کی تاب نہ رھے۔
چونہ ۔ آھک
دبہ ۔ ظرف روغن از چرم خام
راوت ۔ بہادر

کٹگھر ۔ پرچین محکم از چوب‌خار
کھتری ۔ قومے سپاھی پیشہ
گھٹی ۔ کوھسار(گھاٹی) وادی
مندل ۔ نوعے از دھل کہ آں را بہ اردو پکھاوج گویند
مندہ ۔ کسادبازاری ۔
نایک ۔ سرھنگ ، سردار فوج
ھولی ۔ جشن
ھتھیہ ۔ پیل پیکر

ان الفاظ کے استعمال سے معلوم ھوتا ھے کہ مصنف کے زمانے یعنی آٹھویں صدی ھجری کے وسط میں دکن میں ھندی یا ھندستانی بولی رائج تھی، یا کم از کم مسلمان عام طور پر ھندی الفاظ استعمال کرتے تھے ۔

۷ ۔ آخر میں اغلاط کتاب کی تصحیح کے لیے ۸ صفحوں کا صحت نامہ 'تصحیح غلط چاپی' کے عنوان سے دیا گیا ھے جو ص ۸۷۷ سے ص ۸۸٦ تک ھے ۔ کتاب کے حجم کو دیکھتے ھوئے اغلاط طباعت کچھ زیادہ نہیں ھیں۔

۸ ۔ سب سے زیادہ قابل قدر وہ ذیلی حواشی یا 'نوشت' ھیں جو مرتب نے جگہ جگہ دیے ھیں ، ان میں غلط الفاظ کی تصحیح کی گئی ھے یا کسی نامانوس لفظ کے معنی بتائے ھیں ، یا مصنف کے کسی شعر کی تشریح و توضیح کی ھے ۔ ایک جگہ متن میں لکھے ھوے لفظ 'لعل مضاب (؟) کی تصحیح 'لعل مذاب'، سے کرتے ھوئے مرتب نے کتب لغت مثل برھان قاطع وغیرہ میں 'مذاب' کے معنی 'گداختہ' لکھے ھیں ان کو صحیح تسلیم نہیں کیا ۔ انھوں نے اس لفظ کو 'مذ' اور 'آب' سے مرکب لفظ بتاتے ھوے اس کے معنی یہ لکھے ھیں :

'مذ' بمعنی دارا و صاحب و خداوند ۔ 'آب' بمعنی درخشندگی باشد ۔ وایں لفظ مرکب است از 'مذ' و 'آب' معنی دھد 'دارائے آب' یعنی آبدار ۔' (صفحہ ۲۹۳) ۔

اگرچہ بعض لغت نویسوں نے مذ بمعنی صاحب و خدا وند لکھا ہے، لیکن فارسی شعرا نے 'لعل مذاب، (پگھلا ہوا لعل) عموماً شراب کو اس کی سرخ رنگت کے لحاظ سے لکھا ہے۔ اگر مذاب کو عربی لفظ سمجھا جائے تو یہ صحیح نہ ہو گا کیوں کہ صرفی قاعدے سے یہ مذاب نہیں بلکہ مذوب ہو گا، جس کا مادہ ذوب ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ مرتب نے بعض لغت نویسوں کے تتبع میں اسی کو فارسی زبان کا لفظ بتا کر جو معنی لکھے ہیں وہی صحیح ہوں۔

لائق مرتب نے موضوع کتاب، سبب تالیف، حالات مصنف، تاریخ تصنیف کتاب کی تاریخی اہمیت اوراس کی خصوصیات پر پہلے اپنے منظوم فارسی رسالے 'عصامی نامہ، میں اور بعد کو اصل کتاب کے فارسی مقدمہ' نثر میں مفصل بحث کی ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس لیے اس کو یہاں دہرانا تحصیل حاصل ہو گا۔ لہذا یہاں صرف اس قدر بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب شاهنامے کی بحر میں بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جن میں سے مرتب کو ۲۷۳ اشعار دونوں قلمی نسخوں میں نہیں مل سکے ، تاہم اس میں ۱۱۷۲۷ اشعار کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ امر نہ صرف تعجب خیز بلکہ حیرت انگیز ہے کہ مصنف نے یہ بارہ ہزار اشعار بہت ہی کم مدت یعنی صرف پانچ مہینوں اور دس روز میں لکھے ہیں جیسا کہ اشعار ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

به نه روز و شش ساعت و پنج ماه
شروعے نمودم به بیگاه و گاه

پئے خلق نزهت گہے ساختم
ریاضے درین ره به پرداختم
از و غرفه کردم ده و دو هزار
چو گلزار هر یک بوقت بهار (ص ۶۱۳)

معلوم ہوتا ہے کہ عصامی کا مقصد کوئی تاریخ لکھنا نہیں تھا، بلکہ جس طرح فردوسی، نظامی اور ان کے متبعین خسرو اور جامی وغیرہ نے شاهنامه اور سکندر نامه اور اس طرز کی دوسری مثنویاں لکھی ہیں اسی طرح عصامی نے بھی محض 'شاعرانہ مقصد، سے ہندوستان کے مسلمان

سلاطین میں بانیان خاندان کے حالات لکھے ہیں، اور خاص کر ان کی معرکہ آرائیوں اور فتوحات کا تذکرہ کیا ہے، عنوان کتاب خود اس پر شاہد ہے :

شہان را چو دیدم از و فتح باب
فتوح السلاطینش کردم خطاب

یہ ایک رزمیہ نظم ہے جس میں عصامی نے فردوسی اور نظامی کا تتبع کیا ہے۔ ایک جگہ فردوسی اور نظامی کا موازنہ بھی کیا ہے اور اول‌الذکر کو طاؤس اور موٴخرالذکر کو بلبل سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طاؤس اور بلبل کے اجتماع سے ہندوستان میں ایک شکر فشاں طوطی (یعنی مصنف) نے جنم لیا۔ مصنف کو ان دونوں 'نا خدایان سخن، سے خاص عقیدت ہے چنانچہ جابجا اس نے ان کے ہم وزن اشعار اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ خود بھی کہتا ہے :

بسے بیت شہنامہ و خمسہ ہم
بہ تضمین درین نامہ کردم رقم (ص ٦١٥)

مصنف کی عقیدت نظامی سے اس قدر ہے کہ اس کا تخلص بھی اسی بلبل‌ایران کا ہم قافیہ اور ہم وزن ہے۔ شروع کتاب میں مصنف نے نظامی گنجوی کو خواب میں دیکھنے اور خمسۂ نظامی کی پیروی کر کے ان کی شاگردی سے مشرف ہونے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :

پس آنگہ بہ شاگردیش ساختم
ہمان خمسہ را پیش انداختم
چو مشغول نظم نظامی شدم
بہ صد عصمت اینک عصامی شدم
چو کردم شہ گنجہ را پیروی
بہ نامش زدم سکۂ خسروی (ص ٢٠)

اس بنا پر اس نے اپنی مثنوی میں نظامی کا پورا پورا تتبع کیا ہے۔ مثنوی میں حمد، لغت، صفت شب معراج، مناقب خلفا، شکایت روزگار، فضیلت سخن، سبب نظم وغیرہ نظامی کی اولیات سے ہیں۔ جن کی عصامی نے پوری طرح پیروی کی ہے۔

حمد و نعت کے بعد کتاب سلاطین ماضی کے ذکر سے شروع ہوتی ہے، پھر فتح ایران کا ذکر ہے، اور ظہور قدسی صلی‌اللہ علیہ وسلم کے ذکر

مبارک کے بعد، ملک عجم میں طوائف الملوکی اور ترکوں کے غلبہ پانے کا ذکر ہے ۔ پھر ہندوستان کے بادشاہوں کا ذکر بطور 'ایہام و ایجاز، ہے ۔ جس میں ان کی ایسی خصوصیات دکھائی ہیں جن سے وہ فوراً پہچانے جاتے ہیں ۔ مضمون کتاب کا آغاز محمود غزنوی کی ولادت سے ہوتا ہے، اور محمود سے لے کر علاءالدین خلجی اور محمد تغلق تک کے حالات و فتوحات اس میں درج ہیں ۔ کتاب چوں کہ ایک تاریخی رزمیہ ہے، لہذا خشک ہوکر نہ رہ جائے اس لیے مصنف نے اثنائے کلام میں خوش دلی اور لطافت پیدا کرنے کی غرض سے تفریح کا سامان بہم پہنچایا ہے ۔ کبھی تفنن طبع کے طورپر، پرلطف حکایات اور نصیحت آمیز قصے بیان کیے ہیں، کہیں شاہانہ جشن شادی کا بیان قدیم آداب شاہانہ کے مطابق اور کہیں شاہی دسترخوان اور اس کے الوان نعمت کا ذکر کیا ہے ۔ چنانچہ خود بھی کہتا ہے :

در افسانہ گفتم چوکار آگہاں
که آساں شود راہ بر ہمرہاں
عجب مجلسے اندرین کوچگاہ
مرا شد میسر در اثنائے راہ
که دروے مہیا بود جملہ چیز
مے و مطرب و نقل و معشوق نیز

ہر حکمران کے عہد حکومت کے آغاز و انجام میں اس عہد کے 'حوادث، پر تبصرہ کیا گیا ہے تا کہ اس عہد کی اچھائی اور برائی سے لوگ واقف ہوں ۔ اس کے ضمن میں اس نے سلطان علاءالدین بہمنی کو (جس کے نام پر یہ کتاب معنون کی گئی ہے) مفید نصیحتیں کی ہیں ۔

مصنف نے اپنی کتاب میں جو تاریخی واقعات نظم کیے ہیں ان کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے جو قدیم واقعات راویوں سے سنے یا کتابوں میں پڑھے تھے ان کو نظم کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے :

ہر آں قصہ کز راویانم رسید
ضمیرم ز درجش گریزے نہ دید
حدیثے کہ بشنیدم از باستان
کشیدم بہ نظمش درین داستان

دگر آن چه اندر کتب یافتم
سراز درج آن نیز کم تافتم
بر افگند بس در قیمت گران
کشیدم درین سلک چون ناقدان
به تحقیق افسانه هاے کہن
به بردم بسے رنج در هر سخن
حکایات شاهان هندوستان
طلب کردم از باخرد دوستان
همه باتواریخ کردم رجوع
چو دیدم سوافق اصول و فروع
(صفحه ٦١٤ - ٦١٥)

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عصامی نے گو اپنے مآخذ کے نام نہیں گنوائے، تاہم اس نے تواریخ سے رجوع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے واقعات کی صحیح تاریخیں مسلسل دی ہیں اور ایک مورخ کی طرح ان واقعات کو جمع کر کے بیان کیا ہے اور با وجود نظم میں لکھنے کے ان پر افسانوی رنگ نہیں چڑھنے پایا۔

عصامی کے زمانے میں تاریخ فیروزشاہی کا مصنف ضیاءالدین برنی گزرا ہے، جس نے فتوح السلاطین کی تصنیف کے آٹھ سال بعد اپنی تاریخ لکھی۔ اسی طرح منہاج سراج کی طبقات ناصری اور فتاویٰ جہانداری بھی اس کے بعد کی تصانیف ہیں۔ اس لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ عصامی نے کن کن تواریخ سے استفادہ کیا ہو گا۔ چوں کہ اس نے اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کیا غالباً اسی بنا پر تاریخ فرشتہ کے انگریز مترجم کرنل برگو نے فتوح السلاطین کے متعلق یہ غلط راے قائم کر لی کہ : کہ ''تاریخی افسانوں میں فتوح السلاطین ایک غیر اہم کتاب ہے''۔ (تاریخ عروج حکومت اسلامی جلد اول ص ۳۰۶) لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے مؤرخین میں طباطبائی، فرشتہ، وغیرہ نے اس کتاب کی خوشہ چینی کی ہے اور یہ اس کی تاریخی اہمیت کا بین ثبوت ہے۔

کتاب کو اس عمدگی اور قابلیت سے ایڈٹ کرنے کے لیے سید یوشع صاحب مستحق مبارک باد ہیں، اور مدراس یونی ورسٹی کے سلسلہٴ مطبوعات اسلامی میں اس کی اشاعت اس کی اہمیت کا کافی ثبوت ہے۔

تاریخ ابنِ خلّکان کے فارسی ترجمے

عربی کی سیر و تواریخ کی کتابوں میں جو قبولیت عام اور شہرت دوام ابن خلکان(۱) کی کتاب کو حاصل ہوئی ہے وہ اس فن کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، عربی کے تاریخی ادب میں یہ کتاب اس قدر مشہور و متداول رہی ہے کہ اس کو 'تاریخ ابن خلکان، یا صرف ابن خلکان کہدیتے ہیں، حالانکہ اس کا پورا نام 'وفیات الاعیان و ابناءالز مان مماثبت بالنقل اوالسمع وثبته المعیان ہے۔

یہ کتاب ہر زمانے میں اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور اس کے بعد کے اسلامی تذکروں اور سوانح عمریوں کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی، جس میں اس کا حوالہ نہ پایا جاتا ہو۔ باین ہمہ یہ کتاب اس قدر نایاب رہی، کہ ممالک اسلامیہ میں یہ ۱۲۷۵ھ میں طبع ہوئی۔ سب سے پہلے اس کی طباعت کا فخر ایک جرمن مستشرق وستنفیلڈ کو حاصل ہوا، جس نے مختلف مخطوطات کا مقابلہ کر کے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۰ء تک ۱۵ سال کے عرصے میں کتاب کا ایک مکمل نسخہ ۱۳ حصوں میں بالاقساط گوتھا سے شائع کیا، پھر ۱۸۸۵ء میں موسیو پیناپل نے اس کے بعض اجزا لاطینی ترجمے کے ساتھ اسٹرڈام سے شائع کیے مشاہیر اسلام کے حالات و سوانح کی ایک مستند و معتبر کتاب ہونے کے لحاظ سے مشرق و مغرب دونوں میں اس کتاب کے ساتھ اعتنا کیا گیا، اور یورپ کی مختلف زبانوں میں اس کے بعض حصوں کے ترجمے کیے گئے، انگریزی میں اوس کا مکمل ترجمہ فرنچ مستشرق ڈی سلیمن نے چار ضخیم جلدوں میں کیا، فارسی اور اردو میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

---

(۱)۔ قاضی القضاۃ شمس الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن ابراھیم بن ابی بکربن خلکان البر مکی الہکاری الاربلی الشافعی الاشعری، ولادت، ۶۰۸ھ، وفات ۶۸۱ھ۔ ان کے مفصل حالات کے لیے دیکھو طبقات الشافیہ للبسکی، ج ۵ ص ۱۴۔ فوات الوفیات ج ۱ ص ۵۵۔ حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۲۸۶۔

گو اهل ایران نے اس کتاب کے ترجمے کی طرف توجہ نہیں کی، لیکن ہندوستان اور ترکی میں اس کے چار چار ترجمے ہو چکے ہیں۔ ذیل میں ہم ان فارسی تراجم کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہیں ۔

۱ ۔ فارسی کا پہلا ترجمہ سلطان ناصر الدین ابوالفتح محمود شاہ معروف بہ محمود بیگڑہ فرمانرائے گجرات (۸۶۳-۹۱۷ھ) کے حکم سے مولانا یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان (۱) نے 'منظر الانسان، کے نام سے کیا، جیسا کہ مترجم نے مقدمہ' کتاب میں ذکر کیا ھے ۸۸۹ھ میں سلطان نے جانپانیر کو فتح کیا، جس کی تاریخ مترجم نے مقدمے میں کلمہ 'افتتح، سے نکالی ھے، اس کی یادگار میں اس نے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ۸۸۹ھ میں ترجمے کرنے کا حکم صادر ہوا، ۸۹۳ھ میں اس کا آغاز ہوا، اور ۸۹۴ھ میں مکمل ہو کر بادشاہ کے ملاحظے کے لیے پیش ہوا، اور ۲۰ دوسری کتابوں سے اس ترجمے میں اور مطالب کا اضافہ کیا گیا، ۸۹۵ھ میں نظر ثانی کی گئی' منظر الانسان نام رکھا گیا، مورخ محمدبن‌عمر المکی معروف بہ حاجی دبیر (۱۰۲۰ء) مصنف ظفرالوالہ‌نے اس ترجمے کو دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں !

'لقد ترجم بعبارة حسنة تشعر باتقانه فی معرفته اللسانین و یخبر بمایشهدله بفضله کلا الفریقین' علیه الرحمته، (۲)

'عمدہ عبارت میں اس کا ترجمہ کیا گیا ھے جس سے دونوں زبانوں میں مترجم کی واقفیت کامل معلوم ہوتی ھے اور فریقین کے مترجم کی فضیلت کا اعتراف کرنے کی شہادت دیتی ھے ان پر خدا کی رحمت ہو،

فی زماننا اس ترجمے کے چار مخطوطے موجود ہیں :

ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں نمبر (۱۶،۱۳) پر

---

(۱) سید عثمان الملقب بہ 'شمع برہانی، حضرت قطب العالم رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاے کبار میں سے تھے، سلطان محمود کو ان سے بڑی عقیدت تھی ۸۶۳ھ میں ان کا وصال ہو گیا، اور یہی سال سلطان محمود کی تخت نشینی کا ھے، چونکہ محمود شاہ رحمتہ‌اللہ علیہ‌نے پچاس سال (۹۱۷ھ) تک گجرات پر حکومت کی ھے اس لحاظ سے تعجب نہیں، اگر سیدعثمان‌رحمۃ‌اللہ علیہ کے پرپوتے اپنے دادا کے باپ کی وفات سے ۲۸ سال کے بعد ۸۸۹ھ میں (جب کہ ہنوز وہ نوعمر ہوں گے) اس کتاب کا ترجمہ شروع کرتے ہیں ۔ (۲) ۔ ظفرالوالہ بمظفر والہ ج ص ۲۲

موجود ہے اور ۱۰۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، جلد چمڑے کی منقش و مطلا ہے، کل ۳۰۹، اوراق ہیں، عبارت ذیل سے کتاب شروع ہوتی ہے ۔

'آرایش دیباچه مناقب ومآثرسلاطین رفیع اقدار، ۔

کتاب کی آخری سطور میں مترجم نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۷ ۔ربیع الاول ۸۹۳ھ کو شروع ہوا اور ۲۴ رمضان ۸۹۵ھ کو ختم ہوا ۔ اس پر ڈاکٹر ریو نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مترجم نے دیباچے میں ترجمے کا سنہ آغاز ۸۸۹ھ بتایا ہے، وہ اس آخری تحریر سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن بقول مترجم یہ سنہ ترجمہ کرنے کی فرمایش کا ہے، ورنہ ترجمہ کا آغاز تو ۸۹۳ھ میں ہوا ہے، آخر میں مترجم کے نسب نامے سے متعلق یہ نام اضافہ کیے گئے ہیں، '(عثمان) بن علی بن احمد الشجاع السنجری' ترجمے میں اکثر جگہ اصل متن کا اختصار کیا گیا ہے، عربی اشعار جو مصنف نے بکثرت نقل کیے ہیں ان کو یا تو بغیر ترجمہ کے نقل کیا ہے یا بالکل اڑا دیا ہے۔ اوراق ۱ تا ۱۲ پر تذکروں کی فہرست ہے، جو تعداد میں ۸۳۰ ہیں، ورق ۱۳ پر سلطان محمد قطب شاہ کی مہر ہے جس میں ۱۱۱۵ھ درج ہے۔ (۱)

دوسرا نسخہ بھی اسی برٹش میوزیم میں ہے، جلد اول کا ترجمہ حرف ز تک نمبر (۲۳۵۳۸) پر موجود ہے ، پہلے نسخہ میں مترجم کے فارسی دیباچے کے بجائے اس میں ایک طویل عربی دیباچہ ہے جس کے شروع کے دو ایک ورق غائب ہیں، اس میں سلطان محمود کی مدح ہے، (ورق ۳-۴) مگر اس میں سے ابن خلکان کے دیباچہ کا ترجمہ جو پہلے نسخے میں موجود ہے نکال دیا گیا ہے، عربی اشعار کے ترجمے حواشی پر لکھے ہیں جلد دوم کا ترجمہ نمبر ۷۶۶۶ پر ہے، جو، ۳۱، اوراق پر مشتمل ہے یعنی حسب نسخہ' اول ورق ۲۱۶ تا ورق ۳۰۹ ۔ (۲)

تیسرا نسخہ دفتر دیوانی حیدر آباد کے کتب خانے میں موجود ہے جو ۱۰۳۱ھ کا لکھا ہوا ہے اور کاتب کا نام علی بن حسن الالہی ہے (۳)

---

(۱) فہرست مخطوطات فارسی ج ۱ص ۳۳۴

(۲) ایضاً ج،۲ ص ۸۰۹ (۳) رسالہ معارف جون ۱۹۳۶ء مضمون کتب خانہ دفتر دیوانی ۔ اس کے بعد ایک مضمون منظرالانسان کا مصنف ۔(؟) معارف میں شائع ہوا ہے، جس میں ظفر الوالہ کی ایک طویل غیر متعلق عبارت نقل کی گئی ہے اس میں نہ تو مترجم کے حالات پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے، نہ اس کتاب کے کسی مخطوطے کا ذکر کیا گیا ہے

چوتھا نسخہ پروفیسر محمود شیرانی کے کتب خانے میں نمبر ۱۹۹۳ پر موجود ھے، جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ھے۔(۱)

۲ - دوسرا فارسی ترجمہ کبیر بن اویس بن محمد لطیفی نے کیا تھا یہ ترجمہ سلطان سلیم اول فرمانروائے ترکی (۹۱۸ھ - ۹۲۶ھ) کے لیے لکھا گیا تھا، سلطان سلیم کو جب تواریخ اور خصوصاً ابن خلکان کے مطالعے کاشوق ھوا تو اس کا ترجمہ فارسی میں کرایا ۔ یہ ترجمہ نصف ھونے پایا تھا کہ سلطان نے وفات پائی، مترجم کا حال معلوم نہ ھو سکا، لیکن ڈاکٹر ریو نے سلیم نامہ کے مخطوطے کے حوالے سے اس کا نام قاضی عبدالکبیر لطیفی لکھا ھے جو فارسی نثر نویسی پر مامور تھا، حاجی خلیفہ نے اس کو معروف بہ قاضی زادہ لکھا ھے۔

ڈاکٹر ریو کے بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ اس ترجمے کے دو مخطوطے موجود ھیں، ایک سر گوراوسلے کے ذخیرۂ مخطوطات میں نمبر ۳۷۶ پر اور دوسرا کنگز کالج لائبریری میں نمبر ۱۱۰ پر ھے ۔

۳ - تیسرا ترجمہ ظہیر الدین اردبیلی کا (المتوفی صفر ۹۲۰ھ) کا ھے، طاش کبری زادہ نے ان کے تذکرے میں لکھا ھے کہ انھوں نے تاریخ ابن خلکان کا فارسی ترجمہ کیا تھا (۲)

حاجی خلیفہ نے ظہیرالدین کی بجائے اظہرالدین لکھا ھے ۔ اس کا قیاس ھے کہ قاضی زادہ نے اس کتاب کا کوئی ترجمہ نہیں کیا، اس کے نزدیک ظہیرالدین اور قاضی زادہ دونوں ایک ھی شخص ھیں، اور یہ قیاس آرائی خود قاضی زادہ کے ایک فارسی رسالے سے کی گئی ھے، اس کے الفاظ یہ ھیں :

'و ترجمہ (وفیات) مولانا اظہر الدین الاردبیلی بالفارسیۃ و توفی بمصر سنہ ۹۳۰ ثلاثین و تسعمائۃ ورائیت رسالۃ فارسیۃ لکبیر بن اویس بن محمداللطیفی الشھیر بقاضی زادہ المتوفی سنہ ۹۳۰ ثلاثین وتسعمائۃ ذکر فیھا ان السلطان سیلم خان القدیم لما اشتغل بتتبع التواریخ خصوصاً الوفیات لا بن	اور مولانا اظہرالدین اردبیلی المتوفی بمصر ۹۳۰ھ نے وفیات کا ترجمہ فارسی میں کیا ھے، میں نے ایک فارسی رسالہ مؤلفہ کبیر بن اویس بن محمد اللطیفی مشہور بہ قاضی زادہ المتوفی ۹۳۰ھ دیکھا تھا اس میں اس نے یہ بیان کیا ھے کہ سلطان سلیم خان قدیم کو جب تواریخ خصوصاً وفیات

(۱) رسالہ اردو جنوری ۱۹۴۳ء ۔ (۲) الشقائق النعمانیہ بہامش ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۷

خلکان ترجمه بالفارسية وحين وصل
الی نصفهسات السلطان و لعل ذالک
المذکور هوالشهير باظهر الدين
اردبیلی، . . .

ابن خلکان کے مطالعے کا شوق پیدا
ہوا تو اس نے (قاضی زادہ نے) فارسی
میں اس کا ترجمہ کیا، اور جب آدھی
کتاب کا ترجمہ ہو چکا تو سلطان
نے وفات پائی شاید مترجم مذکور
وہی ہے جو اظہرالدین اردبیلی کے
نام سے مشہور ہے۔' (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ کو دونوں کے سنہ وفات ایک ہونے سے دھوکا ہوتا ہے، حالانکہ یہ دونوں جدا جدا شخص ہیں۔ طاش کبریٰ زادہ کے بیان کے مطابق ظہیرالدین کا وفیات ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کرنا ثابت ہے قاضی عبدالکبیر کے ترجمے کے متعلق حاجی خلیفہ نے اس کے رسالے کا حوالہ دیا ہے، وہ خود بتا رہا ہے کہ اس نے سلطان سلیم کی فرمایش پر اس کا ترجمہ کیا تھا، اس پر سلیم نامہ کے مصنف حکیم الدین ادریس بن حسام الدین البدلیسی کی اس شہادت کا اضافہ کرو جو اس نے دیباچۂ کتاب میں پیش کی ہے، جب وہ سلطان سلیم اول کے زمانے میں اپنی تاریخ لکھ رہا تھا تو تین اور آدمی بھی ایسی ہی تاریخی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے، ان میں ایک قاضی عبدالکبیر بھی تھا، جو فارسی نثر لکھتا تھا۔ (۲) اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان سلیم کے لیے جس نے وفیات کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ عبدالکبیر ہی تھا، ظہیرالدین کا ترجمہ اس کے علاوہ ہے۔

۴ ۔ چوتھا ترجمہ ہندوستان میں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ریو نے مخطوطۂ تاریخ محمدی (از محمد بن رستم بن قباد جو ابتدائے ہجرت سے لے کر سنہ ۱۱۹۰ء تک کی تاریخ ہے) کے ورق ۱۳۶ کے حوالے سے لکھا ہے (۳) کہ شیخ کبیر بن شیخ منور لاہوری (المتوفی ۱۰۲۶ھ احمد آباد) نے ابن خلکان کی کتاب کا فارسی ترجمہ کیا تھا، شیخ کبیر عہد اکبری کے علما میں سے تھے چنانچہ مورخ بدایونی نے ان کا ذکر کیا ہے (۴) مگر اس ترجمے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

---

(۱) کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۳۹۹ (۲) فہرست مخطوطات فارسی جلد ۱ ص ۲۱۹
(۳) ایضاً جلد ۳ ص ۱۰۸۵ (۴) منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۱۰۶ ۔

مُلّاعبدالقادر بدایونی

هندوستان کے مسلمان فاتحین کے زمانے سے لے کر دولت مغلیہ کے زوال تک کئی نامور مسلمان مورخ گزرے ہیں جن کی تواریخ کا بہت بڑا حصہ ابتک محفوظ ہے ۔ مسلمان سلاطین کے ہر عہد کی تاریخیں عموماً تمامتر فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں تین قسم کی تصانیف پائی جاتی ہیں :

۱ ۔ ہندوستان کے ابتدائی اسلامی عہد سے لے کر مصنف کے عہد تک کی عام تاریخیں، جیسے فتوح السلاطین، طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ وغیرہ ۔

۲ ۔ خاص صوبوں کے فرماں رواؤں کے عہد کی تاریخیں ، جیسے طبقات ناصری، تاریخ مبارک شاہی، تاج المآثر، اکبر نامہ، آئین اکبری، تاریخ فیروز شاہی ۔

۳ ۔ مخصوص بادشاہوں اور فرمانرواؤں اور خاندانوں کی تاریخیں، جیسے چچ نامہ، برہان المآثر، مرآۃ احمدی، مرآۃ سکندری وغیرہ ۔

پہلی قسم کی تاریخوں میں 'منتخب التواریخ، اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم کتاب سمجھی جاتی ہے جو محمود غزنوی کی فتوحات سے لے کر اکبر اعظم کے عہد تک کی تاریخ ہے۔ اس کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں جو ہندوستان کے مسلمان مورخین میں اپنے علم و فضل اور تاریخ دانی کے لحاظ سے ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں ۔

ملا صاحب کا نام عبدالقادر ان کے والد کا نام ملوک شاہ، خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ ان کا وطن بدایوں تھا ۔ ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ میں پیدا ہوے ۔ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ بدایوں سے سنبھل تحصیل علم کے لیے گئے ۔ میر سید محمد

سکی سے ہفت قرأت قاری بنے، قرآن شریف مع تجوید وقرأت پڑھا، اور بعض علوم عربی اپنے نانا مخدوم اشرف صاحب شیخ پنجو سنبھلی سے پڑھے۔ ۹۶۰ھ میں میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوکر قصیدہ بردہ ان کی خانقاہ میں پڑھا۔ اور اجازت اس کی حاصل کی اور فقہ میں کنزالد قائق کے چند سبق بھی ان سے پڑھے اور ان سے بیعت کی۔ رسمی علوم کی تحصیل ابوالفضل علامی کے والد شیخ مبارک ناگوری سے کی۔ علم فقہ، کلام، وغیرہ حضرت شیخ مخدوم عبداللہ عارف باللہ بدایونی سے آپ نے پڑھا۔ جیسا کہ خود انہوں نے منتخب التواریخ میں ذکر کیا ہے، پہلی شادی سے ایک لڑکا میاں عبداللطیف پیدا ہوا اور بیوی اور لڑکا دونوں انتقال کر گئے۔ تو سنہ ۹۷۰ھ میں بدایون میں دوسری شادی کی جس کے حالات اور تاریخ خود انہوں نے منتخب میں تحریر کیے ہیں۔ شادی کی تاریخ یہ ہے:

چوں مرا از عنایت ازلی
اتصالے بماہ چہرے شد
عقل تاریخ کتخد ائی را
گفت ماہے قرین مہرے شد

شروع میں بدایون کے حاکم حسین خان کی ملازمت میں رہے پھر جلال خان قورچی اور حکیم عین الملک کے توسط سے اکبر بادشاہ تک ان کی رسائی ہوئی اور ۹۸۱ھ میں وہ شاہی ملازمت میں داخل ہوے۔ چہار شنبہ کے دن نماز میں بادشاہ کی امامت کیا کرتے تھے، اس لیے ان کا لقب امام اکبر شاہ ہو گیا تھا۔ اسی سال ابوالفضل بھی ملازمت بادشاہی میں منسلک ہوئے تھے۔ ملازمت کے دوران میں بادشاہ سے ناموافقت مزاج اور بعض مقربین کی بد مذہبی اور گمراہی کی وجہ سے دربار شاہی سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے ہزار بیگھ زمین جاگیر کے منصب داران ہزاری میں ناسزد ہوے اور بادشاہ کے حضور میں نذر گزرانی۔ اس کے متعلق اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

بدرگہ حکام درگاہ و بے گنہ
روی تاکنی بیگۂ چند حاصل

بادشاہ کی طرف سے ملا صاحب کو عربی اور سنسکرت و ہندی کتابوں کے ترجمے کا کام سپرد تھا۔ چنانچہ انہوں نے کئی کتابیں فارسی میں ترجمہ کیں، ان میں کتاب اتھربید شیخ بھاون دکنی برہمن کی مدد سے جو شاہی ملازم اور مسلمان ہو گیا تھا، ترجمہ کی۔ اور

مہابھارت کا ترجمہ کیا جس کا نام 'رزم نامہ' رکھا گیا - پھر رامائن کا ترجمہ چار سال میں کیا - اس کتاب میں ۲۰ ہزار اشلوک ہیں اور ہر اشلوک ۶۰ حرف کا ہے ۹۹۷ھ میں اس کا ترجمہ مکمل کر لیا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے وقت اس کے آخر میں یہ شعر لکھ دیا :

ما قصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند
جان سوختہ کردیم بہ جانان کہ رساند

بادشاہ نے ترجمہ سنا اور بہت تعریف کی اور حسب معمول دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی - ملا صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے اس وجہ سے دیباچہ نہیں لکھا کہ اس میں خدا کی حمد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت لکھنی ضروری ہے اور حمد و نعت لکھنے کا حکم نہ تھا - اس لیے انھوں نے دیباچہ لکھنے سے احتراز کیا - انتخاب جامع رشیدی عربی سے فارسی میں ترجمہ کی - نجات الرشیدی عربی میں تصوف کی کتاب ہے، اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، انتخاب تاریخ کشمیری جس کا پہلے تھوڑا سا ترجمہ شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں کیا تھا اسکو ملا صاحب نے سلیس عبارت میں دوبارہ ترجمہ کیا - اسی طرح عربی میں جغرافیہ کی مشہور کتاب معجم البلدان کا ترجمہ بھی انھوں نے فارسی میں کیا - ان ترجموں پر بادشاہ کی طرف سے ان کو بہت انعام و اکرام ملا اور جاگیریں بھی عطا ہوئیں - ان دس کتابوں کے علاوہ گیارھویں کتاب منتخب التواریخ ہے جس کو تاریخ بدایونی کہتے ہیں - ۹۹۹ھ میں لکھنی شروع کی اور ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ میں ختم کی - اس کی تاریخ خود انھوں نے اسطرح کہی ہے:

شکر اللہ کہ باتمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم گفت
'انتخابے' کہ ندارد ثانی

اس تاریخ میں صفت یہ ہے کہ انتخاب میں سے حرف ثانی یعنی نون کے عدد شمار نہ کیے جائیں، اس طرح 'انتخاب' کے عدد ۱۰۰۴ ہوتے ہیں) - اسی سال ملا صاحب نے ۷۰ برس کی عمر میں بدایوں میں انتقال کیا -

ملا صاحب صرف مذهبی عالم هونے کے علاوه بڑے صوفی اور درویش بهی تهے چنانچه، اپنے زمانے کے اکثر مشائخ اور سلسلے کے بزرگوں کی صحبت سے انهوں نے استفاده کیا هے اور اپنی کتاب میں بهی کهیں کهیں اس کا ذکر کیا هے، چنانچه دو مرتبه شیخ جلال الدین تهانیسری رحمة الله علیه کی خدمت میں حاضر هوے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوهی قدس سره کے خلیفه تهے ۔ حضرت شیخ‌سلیم چشتی فتح پوری کی خدمت میں بهی پهنچے اور ان کی صحبت سے فیضیاب هوے ۔ اس طرح شیخ برهان کالپی‌والے اور شیخ نظام‌نارنولی اور شیخ‌ابوالفتح گجراتی وغیره مشائخ کی خدمت میں پهنچکر ذکر اور شغل میں مشغول هوے ۔ چنانچه انهوں نے منتخب التواریخ میں ان بزرگوں کی صحبت سے مستفید هونے کا ذکر کیا هے ۔ حضرت شیخ نظام الدین امیٹهی وال رحمة الله علیه نے آپ کو تبرکاً کلاه عطا فرمائی اور سلسلهٔ قادریه میں حضرت شیخ داؤد جهنی وال سے بیعت کی چنانچه اپنے مرید هونے کا حال منتخب میں تفصیل سے تحریر کیا هے ۔ شیخ المحدثین حضرت شیخ عبدالحق دهلوی رحمة الله علیه سے ان کے خاص تعلقات تهے اور ان سے خط وکتابت بهی رهتی تهی ۔ ملا صاحب فارسی کے ایک اچهے شاعر تهے ، اور قادری تخلص کرتے تهے ۔ آزاد بلگرامی نے خزانه عامره میں ان کا تذکره لکها هے، اسمیں صرف اسی قدر لکهتے هیں که 'طبع نظمی هم داشت' یعنی طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل تهی ۔ اور اپنی تاریخ کے آخر میں شعراے اکبری کا تذکره لکها هے اور انهوں نے اپنے تذکرے‌میں ان کے دو شعر نقل کیے هیں ۔

حسین قلی خان شیفته اصفهانی نے ان کی وفات کی تاریخ میں جو قطعه کها هے اسمیں ان کی اسطرح تعریف کی هے :-

شاعر خوش کلام و خوش گفتار
زین جهان چونکه ارتحال نمود
از سر اشک شیفته آورد
قادری آه انتقال نمود

'طبع نظمی داشت،، والافقره در اصل فیضی کا هے جس نے ملا صاحب کی سفارش‌میں‌جمادی الاول ۱۰۰۰ ه میں احمد نگر سے لاهور

اکبر بادشاہ کو ایک خط لکھا تھا اور اسمیں ملا صاحب کی فضیلت اور استعداد علمی و فنی کا مفصل ذکر کیا ہے ، چنانچہ اس سلسلے میں فیضی نے ملا صاحب کو شاعری سے بہرہ مند ، عربی و فارسی کا انشا پرداز، نجوم و حساب ہندی سے واقف، ایرانی اور ہندی موسیقی کا ماہر، شطرنج کا مشاق لکھا ہے ۔

ملا صاحب کی تصانیف میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تاریخ ہے اس کا نام 'منتخب التواریخ' ہے ۔ یہ کتاب ۳ جلدوں میں ۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے شایع کی ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ یہ ملا صاحب کی نثر نگاری اور انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے ۔ اس نثر کا مقابلہ ان کی نظم سے کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ملا صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا ۔ یہ کتاب انہوں نے پانچ برس میں لکھی ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ سلاطین ہند کے حالات میں سلطان ناصر الدین سبکتگین سے لیکر ہمایوں بادشاہ کی ۹۶۳ء میں وفات تک۔ دوسرا حصہ اکبر بادشاہ کے حالات میں اس کے چالیسویں جلوس تک ۔ جو مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر لکھے ہیں ۔ تیسرا حصہ علما، فقرا، اور شعرا کے تذکرے میں جو اکبر کے زمانے میں گزرے ہیں۔ دوسرے حصے میں مصنف نے حددرجہ صداقت سے کام لیا ہے اور اکبر کے زمانے میں اس کے تمام حالات اور اس کے دربارکا کچا چٹھا لکھا ہے ۔ ملا صاحب بحیثیت مورخ کے اپنے پیشروؤں سے بلکہ بعد کے مصنفوں سے بھی سچائی اور دیانت داری میں بڑھ گئے ہیں اور اپنےولیِ‌نعمت بادشاہ اپنے دوست احباب یہانتک‌کہ خود اپنے آپ کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا اور دوسروں کے ساتھ اپنے عیوب بھی بیان کر دیے ہیں، غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد ، لکھتے ہیں کہ سنہ ۹۷۹ھ میں ایک اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں جس سے تاریخ نویسی کی روح شاداب ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ نگار کو کیونکر واقعیت نگر ہونا چاہیے مولانا نے (دربار) اکبری میں ملا صاحب کے ذاتی حالات جستہ جستہ ان کی تاریخ سے نقل کیے ہیں اور ان کے فارسی انداز تحریر کا اردو میں چربہ اتارا ہے۔ ملا صاحب نے جہاں بزم کے حلات اپنے خاص دلکش انداز میں بیان کیے ہیں وہاں انشا پردازی سے میدان رزم کی تصویر بھی

نہایت خوبصورتی سے کھینچی ہے - جیسی کہ راجہ مان سنگھ کے حال میں۔ ملا صاحب کو جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا ہے۔ فن تاریخ سے خاص رغبت اور دلچسپی تھی اور مدت سے ان کا ارادہ تھا کہ وہ شاہان دھلی کی ایک تاریخ اختصار کے ساتھ قلمبند کریں اور ہر بادشاہ کا حال لکھ کر اس پر تبصرہ کریں، چنانچہ انتخاب تاریخ کشمیر ختم کرنے کے بعد انھوں نے اپنی تاریخ لکھی - اگرچہ کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے ۳۸ویں جلوس تک کے حالات کا مآخذ تاریخ مبارک شاہی اور طبقات اکبری ہیں اور بقیہ دو سال کے حالات سے انھوں نے اس پر اضافہ کیے ہیں اسمیں انھوں نے اکبری عہد کے جو حالات و واقعات اور ذاتی مشاہدات چشمدید لکھے ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔

بختاور خان نے مرآۃ العالم میں اور خافی خان نے منتخب اللباب میں ملا صاحب کے حالات اور فضایل میں لکھا ہے کہ منتخب التواریخ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑی احتیاط سے پوشیدہ رکھی اور شائع نہیں کیا تھا - ان کی وفات کے بعد جب یہ کتاب ظاہر ہوئی تو جہانگیر کے زمانے میں چرچا ہوا تو بادشاہ نے بھی دیکھی - حکم دیا کہ اس نے میرے باپ کو بدنام کیا ہے، اس کے بیٹے کو قید کرو اور گھر کو لوٹ لو، چنانچہ جو وارث تھے ان کو گرفتار کیا گیا، انھوں نے کہا کہ ہم اس وقت چھوٹے تھے ہمیں اس کی خبر نہ تھی۔ ان سے مچلکے لیے گئے کہ ہمارے پاس سے نکلے تو چاہو سو سزا دو۔ کتب فروشوں سے مچلکے لیے کہ وہ اس تاریخ کو نہ خریدیں نہ بیچیں۔ خافی خان یہ حال لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تعجب ہے کہ اسقدر سختی کے باوجود خاص دارالخلافہ میں کتب فروشوں کی دوکانوں پر سب سے زیادہ یہی کتاب نظر آتی تھی۔ بادشاہ کی اس خفگی کی شہرت عام ہو گئی تھی اس لیے بعد کے عہد جہانگیری کے مورخین نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا -

خاص کر ان کی تاریخ اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور پراز معلومات ہے کہ اسمیں خود اکبر اور اس کے مصاحبین اور درباریوں کی بیدینی اور خلاف شرع کاموں پر انھوں نے سخت اعتراضات کیے ہیں اور اکبر کی مذھبی بدعتوں اور آزاد خیالیوں کی خوب قلعی کھول دی ہے اور اگرچہ وہ اکبر کو براہ راست برا نہیں کہتے لیکن انھوں نے ابوالفضل، فیضی اور

اکبر کے دوسرے حامیوں کی خوب خبر لی ہے جو اکبر کے دین الٰہی کو فروغ دینے کی کوشش کرتے تھے اور اکبر کی مذہبی بے اعتدالیوں اور آزاد خیالیوں میں اسکی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ ملا صاحب نے اپنی کتاب میں اکبر کو 'خلیفۃ الزمان' اور 'ظل الٰہی' لکھا ہے اور حتی الاسکان اپنی تاریخ میں کنایۃً، طنز کے سوا براہ راست اسکی برائی نہیں کی۔ البتہ درباری علما اور مشایخ خصوصاً شیخ صدر اور مخدوم الملک پر خوب چوٹیں کرتے ہیں۔ اور عجیب تر یہ ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کے بیٹوں اور اپنے کرم فرماؤں اور دوستوں ابوالفضل اور فیضی پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے اور مذہبی رایوں میں ان سے اختلاف کی بنا پر اپنے دیرینہ مراسم دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات بھی توڑ دیے ہیں۔ لیکن ان کی طرز تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب مذہبی اختلاف رائے کی بنا پر تھا جس کی وجہ سے وہ اسقدر سختی اور تشدد سے پیش آئے ہیں، غیر شرعی امور پر ان کی دینی حمیت نے ان کو ابھارا اور وہ صریحاً نا جائز اور خلاف اسلام باتوں کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے مذہبی جوش میں ان کے قلم سے بعض سخت فقرے نکل گئے ہیں۔ علامہ آزاد نے بادشاہ کی ان تمام بے دینیوں کو تقاضاے وقت اور ملکی مصلحت قرار دیا ہے، اور اکبر نے جو کچھ کیا مجبوری سے کیا۔ اس کو ثابت کرنے میں اپنا زور قلم دکھایا ہے اور مذہبی اختلاف راے اور بحث و مباحثہ کو روٹی توڑ اور شوربے چٹ ملانوں کی آپس کی دست و گریبانی سے منسوب کیا ہے لیکن بدایونی نے اکبری عہد کی جن بدعتوں اور گمراہیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ چشمدید حقائق ہی پر مبنی ہیں جن کی صحت میں کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حق گوئی نے ان واقعات کو طشت از بام کر کے تاریخی دیانت سے کام لیا ہے۔ اور ان خوشامدی عالموں اور درباری مفتیوں کا پردہ فاش کیا ہے جنھوں نے اکبر کو امام عادل بنادیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے لیے سجدۂ تعظیمی تک جائز رکھا تاریخ بدایونی کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ہر زمانے میں مقبول رہی ہے یہ کتاب تمام تاریخوں میں مستند و ممتاز ہے اور اس کا مصنف مقبول و ممتاز۔

بقول علامہ آزاد وہ دیانت اور امانت اور سچے دل سے شریعت کی پابندی چاہتا تھا۔ خود علامہ آزاد اس کے بھی معترف ہیں کہ ان کی تاریخ اپنے مضمون و مقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ

الماری کے سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے۔ ان کے قلم کی خوبی کے ذکر میں
پھر فرماتے ھیں کہ اس خوبی کی تعریف کس قلم سے لکھوں کہ اکبری
عہد کی ایک تصویر ھے، جزئیات اور اندرونی اسرار ھیں کہ اور تاریخ
نویسوں نے مصلحتاً یا بے خبری سے قلم انداز کر دیے ھیں۔ ان کی بدولت ھم
نے سارے عہد اکبری کا تماشا دیکھا اور بڑی خوبی یہ ھے کہ اصل
حال کے لکھنے میں دوست دشمن کا ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ جن لوگوں کو
برا کہتا ھے وہ بھی جہاں اپنے ساتھ سلوک کرتے ھیں لکھ دیتا ھے۔ جب
کسی بات پر خفا ھوتا ھے تو وھیں صلواتیں سنانے لگتا ھے،،۔

تصحیحات

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۵	زخوباز	زخوباں
۵	۸	غاصه	خاصه
۵	۲۲	نجت	بخت
۵	۲۹	هره	ہر
۵	۳۰	پو	چو
۶	۱۶	سجائے	بجائے
۶	۱۷	وسیدان	دمیدن
۸	۱۴	ما	تا
۱۱	۵	کر چکا	کہہ چکا
۱۶	۱۹	والارءس	والرؤس
۱۷	۹	عیسا	عبسا
۱۸	۵	والنصار ی	والنصاریٰ
۱۹	۱	تحھلبنی	تجعلنی
۱۹	۵	الخم	الخمر
۱۹	۲۸	خدمت	مذمت
۲۶	۲۷	کہ	کو
۲۲	۱	ے	نے آخر
۲۷	۹	فرزوق	فرزدق
۳۱	۱۳	یثال	مثال
۳۴	۱۶	الرجہ	الوجہ
۳۵	۱۳	مقبلک	مقیمک
۴۰	۱۷	ویلیمیوں	دیلیمیوں
۴۳	۹	بلثھری	بلہڑی
۴۴	۱	نوائش	نوالش
۴۴	۲۹	برد جروی	برو جردی
۴۵	۱۹	برد جردی	برو جردی
۷۸	۸	اور	وار
۷۹	۲۲	با	یا

قاضی احمد میاں اختر جونا گڈھی مرحوم (متوفی ۱۹۵۵ء)
دور آخر کے سر برآوردہ عالم و محقق تھے، جن کا نام برصغیر کی ثقافتی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔ ان کے چند نادر علمی شہ پارے اس مجموعے میں یکجا کردئے گئے ہیں۔ یہ ہمارے علمی و تہذیبی سرمایے کا ایک مستقل اور لازوال حصہ ہیں جس سے اہل ذوق اور طالبان علم ہمیشہ بصیرت حاصل کرتے رہینگے۔

ترقی اردو بورڈ تیموریہ کراچی۔۳۳